نگار

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

بقلم غالب

عطیۂ عرشی زادہ

یوں تو غالب کی تمام تحریریں ہمیں عزیز ہیں۔ لیکن اگر وہ خود غالب کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اصل تحریریں ہوں یعنی جن پر "بقلم خود" کا اطلاق ہوسکتا ہو تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی بہت سی تحریریں ادھر ادھر کتاب خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ کچھ تحریروں کے عکس مختلف اوقات میں اخبارات رسائل اور کتب کے ذریعے سامنے بھی آتے رہے ہیں۔ ایسی تمام تحریروں کے عکس کتابی شکل میں شایع کیے جارہے ہیں۔ گویا اس کتاب کی ہر ہر سطر "بقلم غالب" ہوگی۔ جیسے مندرجہ ذیل ایک مکتوب ہے جو غالب نے اپنے شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو لکھا تھا ——— مرتبہ: اکبر علی خاں

زیر ترتیب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس رہنے دیتا ہوں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں پھر اس کو صاف کر کر بھیجدوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھ کو کیا یاد رہیگا میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے ناظم عالی اور شوکت ثانی انہیں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجئے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک زیادہ حد ادب تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب غالب

روز پنجشنبہ ۵ فروری ۱۸۵۷

عکس خط میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

ادارۂ یادگار غالب
پھلواڑ، رام پور، یوپی

آئندہ شمارے میں غالب سے متعلق اہم مضامین شایع ہو رہے ہیں

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین جنوری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۱

ملاحظات ۲ - ۳
سیرت کی تعبیر ... ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ۴ - ۶
کچھ فن کے بارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم ۷ - ۸
حالی کی وطن دوستی ... پروفیسر ہارون خاں شروانی ۹ - ۱۵
باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں محمد عبدالسلام خاں ۱۶ - ۲۴
حسرت موہانی خافی خاں (سید سجاد حیدر یلدرم) ۲۶ - ۲۹
حصہ نظم ــ غلام ربانی تاباں ۔ وقار خلیل ۔ کیفی اعظمی ۔ ۳۰
غالبیّہ اکبر علی خاں ۳۱ - ۴۸

ملاحظات

چینی جارحیت اور پاکستان

چینی جارحیت نے ہندوستان جیسے صلح پسند ملک کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے لائق نفرین ہے۔ چین کا یہ جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان نے بین الاقوامی سیاسی محاذ پر پورے مغربی گروپ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چین کی مسلسل حمایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے تعلقات روسی گروپ اور امریکی گروپ دونوں کے ساتھ ہیں اس لیے اس کا اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھتے ہوئے اتنا اہم اقدام بیحد قابلِ ستایش اور لائق شکر گزاری تھا۔ مگر چین کے موجودہ ارباب سیاست کا یہ رد عمل بخت افسوسناک تھا کہ انھوں نے ہندوستان جیسے بے غرض دوست کو دھوکا دیا۔ اور جھوٹے بہانے تراش کر اچانک حملہ آور ہو گیا۔

اس موقع پر بجا تھا اگر ہندوستان اپنے ہمسایہ ملکوں سے ہمدردی اور بھرپور حمایت کی توقع رکھتا خصوصاً اُن ملکوں سے جو نسلی ذہنی تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں ظاہر ہے کہ ان میں قریب ترین ہمسایہ ملک پاکستان ہے۔ چین کے حملے سے پہلے وہاں کے سربراہوں نے ہندوستان کے سامنے مشترکہ ڈیفنس کی پیشکش کی تھی جو بہت امید افزا ارادہ تھا مگر جب سچ مچ اُن کی حمایت اور ہمدردی کا وقت آیا تو انھوں نے کشمیر کے مسئلے کو لا کھڑا کیا جو حقیقت میں گوناگوں مسائل اور رنگ برنگ مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ اور جس کے لیے پہلا قدم یہ ہوتا کہ دونوں ملکوں کے خواص و عوام میں ناقابل شکست دوستانہ فضا پیدا کر کے یکجہاں ہو کر کوشش کی جاتی۔ اس کوشش کا نقطۂ آغاز یہی ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان غیر مشروط طور پر چین کے مقابلے میں ہندوستان کی حمایت کے لیے میدان میں آ جاتا اور دونوں ملک کشمیر جیسے مسئلے سے خالی الذہن ہو کر اُس ایک درندے کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہو جاتے جو صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے لیے بھی ایک زبردست خطرہ ہے ــــــــــــ مگر پاکستان کے ارباب سیاست و حکومت کو کون سمجھائے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔

نگار اور اُس کے منصوبے

نگار لکھنؤ سے رام پور آ گیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو کا اہم ترین ماہنامہ ہے جس استقامت کا ثبوت اس نے دیا ہے اُس کا دعویٰ اردو کے گنے چنے رسائل ہی کر سکتے ہیں اس کی اشاعت جس پابندی کے ساتھ ہوتی رہی ہے وہ سب جانتے

ہیں۔ اب کہ یہ اپنے تیس سالہ گھر کو چھوڑ کر ایک تازہ بستی میں آباد ہوا ہے یقیناً اس کے سامنے کچھ مشکلات بھی آئیں گی۔ لیکن جس سرزمین میں اس نے دم لیا ہے وہ ہمیشہ سے مہمانوں کو گلے لگاتی رہی ہے۔ صاحبان علم وفن کی جو پذیرائی رام پور کی چھوٹی سی ریاست نے کی تھی اُس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ یہ ایک نئے ولولے اور نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ علم و ادب کی خدمات انجام دیگا۔

نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب بھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دیئے جائیں گے۔ یہ مناسب سمجھا گیا کہ اُن کا اعلان ابھی سے کردیا جائے تاکہ اس ذیل میں جو حضرات ضروری اور مناسب مشورے دے سکیں انکو علم ہوجائے۔

نگار نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جلد از جلد مندرجہ ذیل عنوانات پر وقیع و ضخیم خاص نمبر شایع کرے:

● ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر ● رشید احمد صدیقی نمبر ● خواجہ حسن نظامی نمبر ● اختر شیرانی نمبر ● خود نوشت سوانح نمبر ● مطبوعہ مکاتیب نمبر۔ اور ● غالب نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت اُن کی ذات سے ملی ہے اور اُس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت بیدار ہوئی وہ ذاکر صاحب ہی کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر اُن کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور اُن میں سے بھی کئی ترجمے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے اس نمبر میں یہی کوشش کی جائے گی کہ ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کردیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہوجائیں اور ادب و انشا کے ایک بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہوسکے۔

رشید صاحب کے بارے میں کسی نمبر کا اعلان کرنا اپنی عافیت کو خطرے میں ڈالنا ہے اس لیے کہ وہ اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے اردو کی نمایاں پُرعظمت پیچ در پیچ اور پہلودار شخصیت ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نگار جس کے وہ مستقل لکھنے والے آغاز ہی سے رہے ہیں اگر یہ خدمت انجام نہ دے تو اس پر ایک احساس جرم طاری رہیگا۔ یہ اقدام فریضے کی شکل اس لیے بھی اختیار کرلیتا ہے کہ نگار کا موجودہ مرتب علی گڑھ کا طالب علم ہے۔ اُس علی گڑھ کا جس کی محبت رشید صاحب کے نزدیک اول و آخر سب کچھ ہے۔ اس نمبر میں رشید صاحب کی شخصیت فن پر مضامین کے علاوہ اُن کے سارے بکھرے ہوئے مضامین اور خطوط شامل ہوں گے۔

خود نوشت سوانح اردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور چند گنی چنی تحریروں کو چھوڑ کر اس صنف سے ہم محروم ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں نگار نے اُس دور کے شعرا کو خود نوشت سوانح لکھنے کی دعوت دی تھی اُس نمبر میں شایع شدہ خود نوشت حالات کے علاوہ اور جو کچھ ادھر ادھر بکھرا ہوا مل جائے گا اُس سب کو سمیٹ کر ایک نمبر شایع کرنیکا ارادہ ہے تاکہ ایک انداز کی چیزیں یکجا ہو کر زیادہ مفید اور کارآمد بن جائیں۔

مطبوعہ مکاتیب نمبر میں ایسے سارے مکتوبات جمع کرنیکی سعی کی جائیگی جو پرانے اخبارات و رسائل نیز مختلف کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن کے دوبارہ چھپ جانے سے ہماری بہت سی ادبی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ زبان و بیان کے بہت سے معرکے زندہ ہوجائیں کہ اس کاواک دور میں اُن کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ کام بھی بہت جانفشانی کا ہے اور نہ معلوم کتنا وقت لے اس لیے کہ لاتعداد کتابوں رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کوئی سہل کام تو نہیں۔

غالب نمبر میں جو کچھ ہوگا وہ خالص تحقیقی نقطہ نظر سے ہوگا اور اس کیفیت و کمیت کا ہوگا کہ باطمینان حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اس کی تفصیلات کو شایع کرنا ابھی ہم مناسب نہیں جانتے۔ مگر اتنا یقین دلانا ضروری ہے کہ نہ نگار سے وابستہ توقعات کو بدرجہ اتم پورا کرے گا۔

خواجہ حسن نظامی اور اختر شیرانی اردو نثر و نظم کے دو موڑ ہیں۔ ہماری موجودہ نسل نہ ان کی اہمیت کو جانتی ہے اور نہ اُس ارتقائے ادب سے واقف ہے جس کی یہ دین ہیں۔ دونوں کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ عام سطحی ذہن کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ اس جملے میں کہنے والے کے نزدیک سراسر اپنی ذہنی برتری کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اب غالب فیشن ہے اور اس کے علاوہ نظروں میں سماتا ہی کون ہے۔

آخر میں ذاکر صاحب اور رشید صاحب کے احباب تلامذہ، خصوصاً جامعہ اور علی گڑھ کے ادب دوست حلقوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے متعلق نمبروں کے لیے نگار کو ضروری مواد کی فراہمی میں مدد اور مشوروں سے نوازیں۔

مدیر نگار کو اپنے کرم فرما دوستوں جناب رشید حسن خاں جناب نثار احمد فاروقی جناب گوپی چند نارنگ جناب خلیق انجم جناب تنویر علوی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے نگار کیلئے اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے لکھنے والوں کی یہ نئی نسل جو قلمی کام کررہی ہے وہ اپنی سنجیدہ روش کی بنا پر قابل قدر ہے اور نگار کے صفحات پر بھی وقتاً فوقتاً ابھرتا رہیگا۔

سیرت کی تعمیر

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نائب صدر جمہوریہ ہند)

سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے: ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جمالی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری، ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کر دوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوت فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد میں اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو۔ دوسرے نے کر کے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو، جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قوت فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلہ میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتی تسویف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آسکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظر ثانی و نظر ثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوت ارادہ بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت، یعنی ثباتِ قدم ارادے کو خارجی رکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیئے جاتے یا بالکل ترک کر دیئے جاتے ہیں۔

قوت ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں جن میں تغیر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ یعنی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور بچہ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدت سے عبارت نہیں، اس لیے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کونسی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو۔ مضبوط ارادہ دراصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہوتا ہے ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتہ مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرطِ جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا قصد کر لیں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلہ میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگِ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شرط قوتِ فکر ہے: منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یکسوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے جیسے اندھا ٹٹول ٹٹول کر چلے، لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے، جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوتِ عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتا ہے یا بخت و اتفاق

کے سہارے ڈگمگاتا آگے بڑھتا ہے، ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔ منطقی استدلال اور حکمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی، اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کرکے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجہ پر جرح کی جائے اسے جانچا جائے پرکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش کرکے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان، تعجیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خودغرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکر منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کی ان جھاڑیوں کو پیہم کوششوں سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی فکر کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشو و نما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہوگئی، بس ہر قضیے پر شبہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جا سکتی ہے۔ مگر علمی مسائل پر غور کرنے کی کوشش عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں اور اصول ہی کافی نہیں ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں، مرغوب عام، مقبول عام سطحی دلیلیں، ناممکن مطالبے، ضدیں ہٹ دھرمیاں، جماعتی خودغرضیاں، یہ سب اور نہ جانے کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اسے اپنے لئے گوارا بنائیں گے۔ اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی کے متاع عزیز کی، اور سیرت سازی کی۔ اسی شرط دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں، جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے۔ شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں۔ لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے دوسروں کا عکس رہیں گے اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط اشیاء اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوت حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے حواس ظاہری کے ضمن میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کوئی وہ سب سنتا ہے جس کے لئے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھوکر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ مصور ماہر موسیقی۔ موتی پرکھنے والے، جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوت حس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقات انسانی میں بھی ایسی ذکاوت حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حس ہے۔ کچھ بہت تیز کچھ بہت کند، کچھ ذکی، کچھ غبی۔ بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں۔ آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں، جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں۔ دوسروں کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں، بعض اس کے برعکس انسانوں اور چیزوں کے برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشو و نما پاتی ہے، کتاب کے کیڑے اور تجربی علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں زندگی کی ناکامیاں بچپن میں دل شکستگی، آلام روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کر دیتے ہیں خودغرضی کی شدت خودپرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکہ لطیف سے عاری کر دیتی ہے بے غرض خدمت بے لاگ میل جول اس کو جلا دیتے ہیں آدمیوں سے سابقہ میں۔ عمل کے متنوع تجربہ میں، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے، خلوت میں اکثر ٹھٹھر جاتی ہے، جلوت میں نکھرتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشو و نما میں اس کا بڑا حصہ ہے جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں، اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پتھر کوئی آدمی کیسے بنا دے، اور گوبر کا تودہ انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکنے لگے؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پہ ہر رنگ چڑھ جاتا ہے، یہ ہر تیز رو کے پیچھے چلتے ہیں، مگر بس تھوڑی دور، یہ ہر تحریک کے علمبردار بن جاتے ہیں مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں، آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے در پے ہوتے ہیں۔ ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں! بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ نیک دل، ہلکے پھلکے لوگ، مگر سیرت کی یکسوئی انھیں نصیب نہیں ہوتی۔ سیرت بنتی ہے ان کی جن کے ذہن میں آکر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے۔ ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر لیتے اس کو سب نئے تجربات و واردات کا محور بناتے ہیں بجز زندگی کی ہر ہوا کو اپنی اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے اور یہ وابستگی فکر وضمیر اگر اقدار متعلقہ سے ہو جائے تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا، جاگنا، مرنا جینا سب کچھ اسی کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت میں بدل جاتی ہیں۔

آئندہ شمارے کے متوقع مضامین

غالب کے چند نایاب فارسی خطوط ——— نثار احمد فاروقی
دیوان حسین علیخاں شاداں (شاگرد غالب) ——— رشید حسن خاں
غالبیہ (دوسرا باب) ——— اکبر علی خاں
غالب کے یہاں سہل ممتنع ——— راز یزدانی
غالب اور صہبائی ——— مالک رام

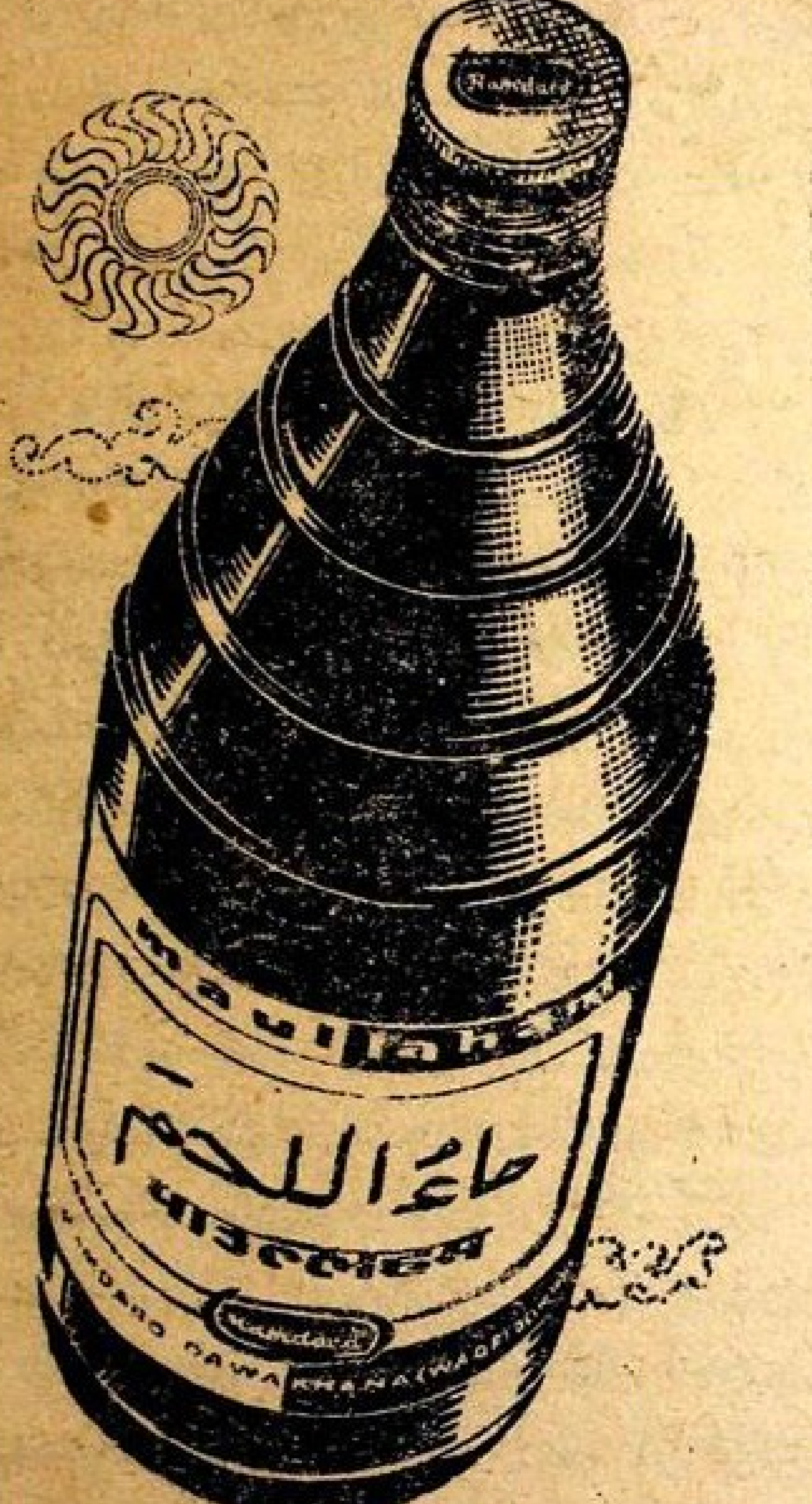

ہمدرد کا ماءُ اللحم
بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

ہمدرد
دہلی
کانپور
پٹنہ

mas. HMD. 1334 B

کچھ فن کے بارے میں

ڈاکٹر عبد العلیم

فن انسان کے جذبات اور احساسات کی تصویر ہے۔ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرقع ہے۔ اُس کے ارتقا اس کی تہذیب، اور اس کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ فن افراد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماج کے اجتماعی واردات کی ترجمانی کرتا ہے۔ سماج کے تصور سے الگ فن کا تصور ناممکن ہے۔ اگر افراد سماجی رشتوں میں منسلک نہ ہوتے اور ان سماجی رشتوں کو مرتب اور مضبوط کرنے کے لئے انھیں ہمکلامی، ہمدردی، ہمرنگی اور ہم آہنگی کی ضرورت نہ ہوتی تو نہ زبان و ادب کا وجود ہوتا نہ نقاشی اور مصوروں کا ظہور ہوتا اور نہ رقص و موسیقی نمودار ہوتی۔ ضروریات زندگی کی پیدائش اور فن کی تخلیق میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

جب سے انسان نے فن کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحصیل بھی شروع کی اسی وقت سے یہ خیال عام ہے کہ جس طرح فن سماجی زندگی کا آئینہ دار ہے اسی طرح وہ سماج کو بہتر بنانے کا ذریعہ بھی ہے اور اسی وقت سے انسان نے اس کو شعوری طور پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ غیر شعوری طور پر وہ ہمیشہ سے ایسا کرتا آیا ہے۔ ادیان و مذاہب کی تبلیغ میں فن کا جو نمایاں کارنامہ ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں نظم اور نثر، مصوری نقاشی، رقص اور موسیقی غرض یہ کہ فن کی ہر صنف کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اسی طرح سماج کے دوسرے مسائل کو بھی فن کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان نے ہمیشہ فن کو سماجی عمل کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے اور اس کے تقاضوں سے ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ فن برائے فن کے نظریہ کو انسان نے بحیثیت مجموعی کبھی تسلیم نہیں کیا۔ صرف موجودہ دور میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس نظریہ کی علمبرداری کی ہے، مگر اس زمانے میں بھی اگر ساری دنیا کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کو قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرانے زمانے میں ایسا فن تخلیق نہیں ہوا جو سماجی اور اخلاقی اقدار کے منافی ہو۔ ہوا اور اکثر ہوا۔ لیکن کسی نے نظری اعتبار سے ایسے فن کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔ جاگیردارانہ سماج میں فن کو امراء کی تفریح کا سامان بنایا گیا اور بے شمار ہنرمند فن کار درباروں کی خدمت میں اپنے فنی فرائض سے بے نیاز ہو گئے۔ لیکن اس قسم کے فنکاروں کو کبھی سراہا نہیں گیا اور نہ خود ایسے فن کاروں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا کہ محض تفریحی فن کی تخلیق کوئی عظیم کارنامہ ہے۔ یہ افتخار صرف موجودہ دور کے ایک محدود گروہ کو حاصل ہے کہ وہ فن کو سماج سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے عجیب و غریب نظریے تراشتا ہے۔

فن برائے فن کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ فن مقصود بالذات ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کا مطالبہ ہے جو مفرادیت پسندی کی شدت کی وجہ سے سماج سے اپنا رشتہ توڑنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس بے نیازی کو اس کی منطقی حد تک پہنچایا جائے تو زندگی سے بھی رشتہ توڑنا پڑے گا۔ بود و باش، کھانے پینے اور زندگی کی دوسری ضروریات کے لیے تو وہ سماج کا سہارا بڑی خوشی سے لیتے ہیں لیکن جب سماجی ذمہ داریوں کا ذکر آتا ہے تو آزادیٔ فکر و فن کی آڑ لے کر ان سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کے کچھ بنیادی لوازم ہیں جن سے فنکار کو بے نیاز نہیں ہونا چاہیئے۔ تبلیغ کے جوش میں جمالیات کو نظر انداز کر دینا فن کار کے لئے سم قاتل ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ فن کا اچھا نمونہ نہیں پیش کر سکتا بلکہ اپنے تبلیغی مقصد میں بھی ناکام ہوگا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے اور مقصدی فن کے حامیوں کو اس کی تفصیلات پر برابر نظر رکھنی چاہیئے فن کے مقصد اور منہاج کے بارے میں عمومی اتفاق کے باوجود اس سے متعلق بنیادی اختلافات بھی ہیں مثلاً ایک گروہ

ہئیت پسندوں کا ہے جو فن کو ابدی قدروں کا حامل بنانا چاہتا ہے، اور دوسری جماعت حقیقت پسندوں کی ہے جو زمانے اور ماحول کی بدلتی ہوئی حقیقتوں اور مستقبل کے امکانات کی عکاسی کو فن کی بنیادی فرائض میں شمار کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جن ابدی قدروں کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سچائی، نیکی اور حسن۔ یہ قدریں اس معنی تو ضرور ابدی ہیں کہ ان کا مجرد یا بسیط تصور ہمیشہ انسانوں کے لئے کشش کا باعث رہا ہے۔ لیکن اگر ان قدروں کے اجزائے ترکیبی کی تحصیل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عہد بہ عہد انسانوں نے ان تصورات کی شرح و تفسیر کس طرح کی ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابدی قدریں بھی زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد نہیں ہیں۔ فن اور اخلاق کے باہمی ربط کو ہر دور کے ارباب فکر نے موضوع بنایا ہے اور اس کے بارے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے ہیں۔ فن کی طرح اخلاق سے متعلق بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کی ابدی قدریں اور اخلاق کی ابدی قدریں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فن کو اگر اخلاق کا پابند کیا گیا تو وہ بے رنگ اور بے جان ہو جائے گا۔ اخلاق کے باب میں بھی یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو تو ہر دور اور ہر قسم کے سماج میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کی ہئیت ترکیبی اور اس کے بنیادی اصول میں بھی وقتاً فوقتاً تغیر اور تبدل رونما ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف اخلاق کی ماورائیت پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کی اضافیت پر اصرار ہے۔ سماجی رشتوں میں جب بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اخلاق کا معیار بھی بدلتا ہے۔ خیر مطلق کا تصور ایک مفروضہ ہے جس کے سانچے میں انسانی عمل کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انسانی سماج کے ارتقاء کے تقاضے اس سانچے کو اکثر غیر محسوس طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ فن ہر دور کی اخلاقی قدروں سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اس تاثر کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ نہ تو فن کار معلم اخلاق ہے اور نہ اس کا فن پارہ تہذیب اخلاق کی درسی مشق۔ اگر فن کار شعوری طور پر درس دینے بیٹھے گا تو یہ خطرہ غالب ہے کہ اس میں تخیل اور احساس کی وہ کیفیت باقی نہ رہ سکے گی جو فنی شاہکار کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو فن کو اخلاق سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور فن کے ذریعہ اخلاق مزاج قائم کرنا چاہتے ہیں میری ناچیز رائے میں سماج کے دشمن ہیں۔

اس مختصر بحث میں ایک مزید پہلو کی طرف صرف اشارہ ہی ممکن ہے اور وہ ہے جمالیات کی بحث۔ اس کے بارے میں بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے لیکن سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقیات سے بھی زیادہ جمالیات کے اصول بدلتے ہوئے سماجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہر دور کی چند جمالیاتی قدریں ہوتی ہیں اور ہر سماج میں حسن کو پرکھنے کا ایک حد تک مشترک معیار رہتا ہے۔ ہر فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس معیار کو مدنظر رکھتا ہے اور ہر کامیاب فنکار وہی ہے جو اس میدان میں تقلید اور اجتہاد کا توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ فنی اسلوب میں اگر ایک طرف جامد تقلید اکتا دینے والی چیز ہے تو دوسری طرف بے پناہ جدت پسندی بھی بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔ فن کا بنیادی مقصد یہی تو ہے کہ فن کار اپنی جمالی احساسات کو اپنے ناظرین یا سامعین تک پہنچا سکے اور ان کے احساسات میں حرکت پیدا کر سکے۔ کبھی کبھی یہ کام چونکا دینے والی جدت سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جدت میں روایت بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو فنکار کوئی قابل قدر مقام نہیں حاصل کر سکتا اور اس کی جدت کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو سطح آب پر حباب کی۔ فن میں جمالیات کا صحیح مقام متعین کرنا بھی ضروری ہے اس میں عام طور پر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ فن کی بنیاد جمالیات پر ہے اور جو فن کار جمالیات کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا وہ بڑا فن کار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جمالیات کو مطلق یا مقصود بالذات سمجھنا اور اس کو سماجی ماحول یا انسانی فلاح کے مقصد سے بے نیاز تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔

چھیڑ غالب سے چلی جائے: غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دلچسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے۔ قیمت ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

حالی کی وطن دوستی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب آمیز موڑ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو انگریزوں نے ۱۷۶۵ء ہی سے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے تھے، اور ملک کا سیاسی و سماجی مرکز، یعنی مغل تاجدار ان کا وظیفہ خوار بن گیا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغلوں کے آخری نام لیوا بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا جہاں انھوں نے اور ان کی ملکہ زینت محل بیگم نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں گذارے۔ اب انگریز تمام ملک پر چھاگئے، اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے لگے۔ سرسید احمد خاں نے ہندوستان کی نکبت اور سیاسی بدحالی دیکھی تو انھوں نے اس کا مداوا یہ قرار دیا کہ ہندی مسلمان اگر تعلیم سے بہرہ ور ہو جائیں، تو وہ ملک کی ترقی میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ مولانا حالی اس نتیجے پر پہونچے کہ عالمی مسلمان عموماً اور ہندی مسلمان خصوصاً جس ابتذال اور پستی کی طرف جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدریں فنا ہو گئی ہیں جن کے سبب سے وہ کسی زمانہ میں معزز و سربلند ہوئے تھے۔ وہ ہندی مسلمانوں کو ہندوستان کی آبادی کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور ان کی اخلاقی ترقی کو وہ پورے دیس کی اخلاقی ترقی سے منسوب کرتے تھے۔

ساٹھ باسٹھ برس کی بات ہے۔ مسدس حالی کا شمالی ہندوستان میں بڑا چرچا تھا، اور ہر پڑھا لکھا اس مسدس مد و جزر اسلام کو شوق سے پڑھتا اور اور اس مناجات کو جو اس مسدس کے تتمے کی طور پر چھپی ہوئی ہے گنگناتا تھا۔ میرے والد حاجی موسیٰ خاں صاحب مرحوم نے مجھے اسکول میں داخل کرنے سے پہلے تھوڑی بہت اردو، فارسی، عربی، گھر پر ہی پڑھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میرے لیے جو گھر یلو نصاب بنایا گیا تھا اس میں مسدس حالی بھی شامل تھی، اور میرے استاد مولوی امان الرحمن صاحب دھلوی نے مجھے یہ مسدس کم و بیش حفظ کرا دی تھی۔ اسکول فائنل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میرے والد ماجد نے مجھے اوائل عمری میں انگلستان بھیج دیا۔ ۱۹۰۹ء میں بڑی چھٹیاں گذارنے کے لئے ڈھائی مہینے کے لئے گھر آیا۔ اس زمانہ میں علیگڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک مرحوم تھے جن سے والد مرحوم کے گہرے روابط تھے۔ مولانا حالی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم نے انھیں ٹھہرانے پر مدعو کیا اور والد مرحوم کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر مجھے مولانا کی بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور بچپن میں مسدس حالی کے جو اثرات میرے دل و دماغ پر پڑے تھے وہ اس وقت تک قائم تھے۔ میرے اوپر مولانا حالی کی ہم نشینی کا بہت اثر ہوا۔ آج بھی ان کا نورانی چہرہ، سفید گول داڑھی، کالی ٹوپی، کالی اچکن، گلے میں رومال بندھا ہوا، گٹھا ہوا بدن، دل پر نقش کیے ہوئے ہیں اور ان مٹے ہیں۔ یہ میری پہلی اور آخری ملاقات مولانا حالی سے تھی۔ میرے ولایت سے واپس آنے کے چند مہینے بعد حالی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اردو ادیبوں کے حلقوں میں عام طور پر اور علیگڑھ کے حلقوں میں خاص طور پر ان کی وفات کا کس قدر اثر پڑا تھا۔ میں یہاں اس نظم کے دو بند پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں جو اس زمانے کی مشہور شاعرہ اور شروانی خاندان کی مایہ ناز خاتون۔ ز۔ خ۔ ش مرحومہ نے حالی کی موت پر لکھا تھا وہ کہتی ہیں:۔

سوکھنے پائی نہ تھی چشم گہر بار ابھی — اور تھی سیرابی صد کشت کو طیار ابھی
بھرنے پایا تھا نہ زخم دلِ افگار ابھی — گھٹنے پایا تھا نہ رنج و غم بسیار ابھی
ہم نہ بھولے تھے غم شبلی غمخوار ابھی — مٹنے پائے تھے نہ اس سوگ کے آثار ابھی
کر دیئے زخم ہرے پھر فلک اخضر نے — پھر کیا خون دل مے مرخی چشم ترنے

جانے دے جانے دے او سائل حال حالی   دشمن صبر و تحمل ہے خیالِ حالی
کیوں نہ صد چاک کرے دل کو ملال حالی   نہ ملی ہے نہ ملے ہم کو مثالِ حالی
دائمی زیست کا ساماں ہے کمال حالی   نظر آئیں گے کتب میں خد و خالِ حالی
نام چمکے گا مسدس سے سدا چوں خورشید   مرنے دے گی نہ کبھی اس کو حیات جاوید[1]

جیسا کہ اس مرثیے میں بیان کیا گیا ہے مولانا حالی کی مسدس مد و جزر اسلام، موسومہ مسدس حالی، اور ان کی سوانح عمری سر سید احمد خاں، موسومہ حیات جاوید، دو ایسے جواہر ریزے ہیں جو اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دونوں علیگڑھ تحریک کے آفریدہ ہیں[2]

مولانا مسدس کے پہلے دیباچہ میں جو ۱۲۹۶ھ - ۱۸۷۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:-

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے دشوار گذار راستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتان و خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں پیروں پر چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ وہ اولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے نہ اسے راستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے اس کی ایک نگاہ ادھر پڑ گئی اور اپنا کام کر گئی .....

در فیض است منشیں از کشاکش نا امید اینجا   برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑی میں ایک ابال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متعدد حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے ان سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی ....."

اس سے پہلے دیباچہ کی ابتدا مولانا اس مشہور رباعی سے کرتے ہیں:-

بلبل نے چمن میں ہم زبانی چھوڑی   بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی[3]

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا دل ۱۸۵۷ء کے واقعات اور دلی کی بربادی کی وجہ سے پرانی قسم کی عشقیہ شاعری سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ انھوں نے دلی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ان کے حب وطن کا آئینہ دار ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ   نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل   ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب   درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

---

[1] ز۔ خ۔ بش! فردوس تخیل، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص ۳۳۴

[2] بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ حیات جاوید کے لکھے جانے کے محرک راقم الحروف کے تائے صاحب نواب اسمٰعیل خاں مرحوم تھے۔ مولانا حالی اس کتاب کے دیباچے طبع اول میں لکھتے ہیں:- "کچھ دنوں بعد سر سید کے نہایت خالص مخلص ذات آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو، اردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے .... ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیے۔"

[3] مد و جزر اسلام، پہلا دیباچہ، ۱۲۹۶ھ

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہر گز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہر گز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہر گز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خواب — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہر گز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہر گز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ رلانا ہر گز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہر گز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہر گز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی — یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہر گز [1]

یہ نظم پوری کی پوری قنوطیت میں ڈوبا ہوا ایک مرثیہ ہے، دل سے نکلی ہوئی ایک آہ ہے۔ جیسے کوئی مرجائے تو پس ماندوں کے لئے نالہ و بکا کے علاوہ کوئی دوسری کیفیت نہیں ہوتی، اسی طرح حالی کے نزدیک دلی مرچکی تھی اور دوبارہ اس کا جنم لینا ناممکن تھا۔ انھوں نے یہ دیکھا تھا کہ انگریزوں نے آزادی کے متوالوں کو کس بے دردی اور بے رحمی سے ختم کیا تھا اور اب حالی کسی قسم کی بہتری سے نا امید ہو چکے تھے۔ وہ گویا گنگنانے لگتے ہیں :-

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے [2]

سر سید کے اثر نے اس قنوط کو رجا سے اس یاس کو آس سے تبدیل کر دیا۔ سر سید ایک عملی انسان تھے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کی خونچکاں داستان اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی مگر ابتدا ہی سے وہ اس فکر میں تھے کہ ملک کی حالت میں جو عظیم تبدیلی ہوئی ہے اور ملک پر تاریکی کی جو گھنگھور گھٹائیں امنڈ آئی ہیں ان کا مداوا کیا ہے، اور یہی وہ محرک تھا جس نے حالی کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ملک پستی کے جس گڑھے میں گر گیا ہے اس پر صرف رونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ بلکہ ان تدبیروں کو سوچنا ہے جن کو اختیار کرنے سے شاید وہ از سر نو ابھر آئے۔ حالی ۱۸۷۱ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بنیاد اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک ہے اور جس کی حقیقت نہ ماننے سے سلطنت کی بڑی خوبی آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی اگر سچ پوچھیے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں .... مگر مسلمانوں نے اب بھی بے پروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پود نہ لگائی تو ان کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے ...." [3]

ایک اور مضمون میں جو ۱۸۷۹ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا وہ علی گڑھ کا حال لکھتے ہیں:-

"اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی، مگر جس قدر مدرسے کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے ممبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں ہم حال

---

[1] نوائے آزادی، ادبی پبلشرز، بمبئی ۱۹۵۷ء "مرثیہ دہلی" ص ۱۸
[2] مد و جزر اسلام، دیباچہ، سنہ ۱۲۹۶ ہجری۔
[3] حالی: سید احمد خاں اور ان کے کام، مقالات حالی، ص ۳

وقال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں ہم نے پیران طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلانے والے نعرے بھی سنے ہیں مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت...... اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی .... ہم مدرسۃ العلوم کے اس وسیع میدان میں عین دھوپ کے وقت ایک پیرمرد سفید پوش، نورانی صورت اور عالی دماغ آدمی کو باوجود کبر سن اور فربہی مفرط کے نہایت ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پیادہ پھرتے دیکھ آئے ہیں اور اس کے سوا اسے رات اور دن اس کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو اس شخص سے یہ عظیم الشان کام لینا ہے۔ نہ رئیسوں اور تعلقہ داروں کی بے پروائی اس کے ارادوں کو روک سکتی ہے اور نہ زید و عمر کی مخالفت اس کی ہمت توڑ سکتی ہے[1]......

"جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی[2]

انھوں نے غزل کی بجائے نظم کو اپنا شیوہ بنایا اور مبالغہ پسندی کی بجائے حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے، تو حسن اتفاق سے انھیں اس میدان کا ایک ہمسفر مل گیا۔ انھیں سات آٹھ برس تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ ان کی جاگیر جہانگیر آباد ضلع بلند شہر رہنے کا موقع ملا۔ نواب صاحب بھی" مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اسی کو منتہائے شاعری سمجھتے تھے۔"[3]

ایک طرف آسان زبان میں نظم لکھنے کی طرف میلان دوسری طرف سرسید کی "ترغیب" یہ دونوں مسدس اور بعض دوسری نظموں اور مثنویوں کے لکھنے کے محرک ہوئے اور یہ سب نظمیں اور مثنویاں ایسی ہیں کہ ان میں سماج کی برائیوں اور ان کی اصلاح کا طریقہ دکھایا گیا ہے۔

مسدس کے اصل میں دو حصے ہیں ایک کو قنوطی کہنا چاہیئے اور دوسرے کو جسے حالی نے "ضمیمہ" کا لقب دیا ہے۔ رجائی۔ دونوں حصے ایک اعتبار سے ایک دوسرے کا تتمہ ہیں پہلے حصے میں اسلام کے سچے اور اچھے اصول، ان اصول کی باعث مسلمانوں کا دنیا میں پھیلنا اور تہذیب و تمدن علم و عمل کی تلقین اس کے بعد ان کا زوال، تہذیب کے اصولوں کی بھول، دوسروں سے تعصب، آپس کی نفرتیں، بداخلاقی، غیبت، حسد، تکبر، کوربا طنی، کذب و مبالغہ، ایسی بد عادتوں سے ایک عظیم الشان قوم کو کیسے تنزل ہوا۔ یہ سب بیان کیا گیا ہے مسدس کے پہلے حصے کے آخر میں وہ حسرت و یاس سے کہتے ہیں:-

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے　　سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانہ کی عادت یہی ہے　　طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر
کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی　　کہاں ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی　　مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا[4]

---

[1] حالی: مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ، مقالات حالی، صفحہ ۱۳۱
[2] مدوجزر اسلام، دیباچہ ۱۲۹۶ ہجری
[3] ترجمۂ حالی، مقالات حالی صفحہ ۲۶۷
[4] مدوجزر اسلام خاتمہ

دوسرا حصہ، یعنی ضمیمہ، ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی جا سکی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں اسکول میں جملہ ۲۰۰ طلبہ اور ۱۸۸۵ء میں کالج میں جملہ ۵۰ طلبہ تھے جو اس زمانہ کے حالات سے بہت سمجھے جانے چاہئیں[1]۔ نا امیدی کی جگہ امید کی لہر حالی کے دل و دماغ میں موجزن ہو گئی تھی۔ اسی لئے انھوں نے اس حصے کو امید کے ان الفاظ سے شروع کیا ہے:-

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں!

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے
عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا![2]

اس حصے میں وہ ان عادتوں اور خصلتوں کا جائزہ لیتے ہیں جنھیں اختیار کرنے سے قومیں بگڑ کر بن سکتی ہیں، یہ عادتیں محنت پسندی، غمخواری بنی نوع انسان، علوم و فنون سے رغبت، جدید علوم کا اکتساب، علم والوں کی قدر افزائی، یہ سب مولانا حالی کے نزدیک ایسی خصلتیں ہیں جن سے گری ہوئی قومیں ابھر سکتی ہیں۔

مسدس میں زیادہ تر ہندی مسلمان مخاطب ہیں مگر جو خصلتیں کسی قوم کو بناتی ہیں اور جو عادتیں انھیں بگاڑتی ہیں وہ کچھ اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ ان کا اطلاق کسی قوم پر بھی ہو سکتا ہے۔ حالی نے نہ صرف اپنی مسدس میں تعصب کو جہنم سے تعبیر کیا ہے[3]۔ بلکہ اس بدخصلت پر ۱۸۸۲ء میں ایک مستقل نظم بھی لکھی ہے، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ انسان سمجھے کہ وہ خود کمالات کا پتلا ہے اور اسے اپنی خرابیاں دوسروں کی اچھائیوں سے بہتر نظر آئیں وہ کہتے ہیں کہ تعصب ایک دھوکا ہی دھوکا ہے اور اگر کوئی قوم اپنی بری چیز کو بھی اچھی چیز سمجھتی ہے تو جان لینا چاہیے کہ اس کے برے دن قریب ہیں۔

دیکھا جب عالم انصاف کا رنگ
ہم کو خود لانے لگا آپ پہ ننگ
خوبیاں اپنی جو تھیں ذہن نشین
ان پہ ہم کرنے لگے خود نفرین
عیب سب اپنے نظر آنے لگے
آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا
اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا
قصر دالیواں کا گماں تھا جن پر
نکلے وہ خروہ گڑھے اور کھنڈر
جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا
ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

---

[1] افتخار عالم: تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ صفحہ ۱۳۵ مکمل جدول کو راقم الحروف نے اپنے مضمون "سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد" میں نقل کیا ہے جو کتاب "علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز" صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۲۱۵ پر چھپا ہے۔

[2] مد و جزر اسلام، ضمیمہ، ۱۳۰۳ ہجری

[3] "تعصب کو ایک جزو دیں سمجھے ہیں ہم ؛ جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم"

نکلے سب ہیچ خیالات اپنے ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے [1]

تعصب کی برائی سے ایک قدم آگے بڑھیئے تو حالی کو حب وطن کے گن گاتے پائیں گے اس موضوع پر ان کی ایک مستقل مثنوی ہے جو ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی تھی اس کے آغاز میں حالی کائنات کی خوبصورتی پر جھومتے ہیں اور ناز کرتے ہیں مگر کہتے ہیں [2]

اے وطن اے مرے بہشت بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری ہی دوری ہے مورد آلام تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

....

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
ہے نباتات کا نمو تجھ سے روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

....

وہ کہتے ہیں کہ حب وطن ہر دوسرے جذبے سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ وہ پوچھتے ہیں :۔

نام ہے کیا اسی کا حب وطن جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

وہ اب بیان کرتے ہیں کہ اصلی حب وطن کونسا جذبہ ہے :۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

مثنوی کے آخری بندوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی سماجی مساوات کے کس حد تک قائل تھے۔ فرماتے ہیں :۔

جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کا یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک کر دو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
مقبلو مدبروں کو یاد کرو خوش دلو غمزدوں کو یاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

اس کے بعد وہ سچی وطن دوستی کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی وسیع مشربی کا پورا ثبوت دیتے ہیں :۔

---

[1] حالی تعصب و انصاف، مجموعہ نظم حالی، صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۶۶

[2] حالی: حب وطن مجموعہ نظم حالی صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۳۱

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہر مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو اس میں یا برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا کہ ہو بشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

اب ملاحظہ کیجیے :۔

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں ہوتا اتفاق اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنی نگاہ

حالی بھی سرسید کی طرح دل سے وطن دوست تھے۔ مگر جس نکبت اور افلاس کی حالت میں وطن عزیز کی آبادی کا ایک حصے نے اپنی قابل رشک اور اعلیٰ مرتبہ کھو دیا تھا۔ اس پر وہ سر دھنتے ہیں اور اس نکبت و افلاس کا تجزیہ کرنے کے ساتھ وہ بعض عالمگیر حقیقتوں اور اصولوں تک پہنچ جاتے ہیں جو قوموں کے عروج و زوال کا باعث ہوتے ہیں۔ سرسید کی طرح انھیں بھی اس کا یقین ہے کہ جب تک گاڑی کا ہر پہیہ اپنا اپنا کام کرنیکا اہل نہ بن جائے گا اس وقت تک گاڑی کا چلنا محال ہے۔

یہاں ایک دل چسپ بات یہ کہنی ہے کہ جس طرح سرسید کا حالی پر اثر تھا اسی طرح سرسید بھی حالی سے متاثر تھے اور مسدس حالی کا تو اُن پر خاص اثر پڑا تھا۔ ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء کو وہ شملے سے مولانا حالی کو لکھتے ہیں :۔

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ وہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے .... اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جس میں میری طرف اشارہ ہے۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں .... مسجد کے اماموں کو چاہیئے کہ خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں .... لڑکے ڈنڈوں پر باندھے پھریں .... قوال درگاہوں میں گائیں حال لانے والے اس پچے حال پر حال لا دیں ......"[1]

....

جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف حالی میں حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا تو دوسری جانب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے سامنے رازوں کو آشکارا کریں جن کی وجہ سے جاہل وحشی اور خونخوار عرب ایک عظیم الشان اور لاثانی مسلک پر عمل کر کے تہذیب، شائستگی، دیانت اور انسان دوستی میں دنیا بھر کے معلم بن گئے۔ جب تک وہ سرسید سے نہ ملے تھے اس وقت تک انھیں دنیوی نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تھا۔ لیکن سرسید سے ملنے کے بعد یکایک ان میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا اور ان کے دماغ نے ایک نئی روشنی محسوس کی انھیں اس کا اندازہ ہونے لگا کہ ہندی مسلمانوں کے مرض کا ایک اور صرف ایک نسخہ ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے اخلاق اور اپنے کردار کو درست کریں، اپنے وطن سے محبت کریں، اسلاف نے جو نمونے چھوڑے ہیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور جدید علوم سے استفادہ کریں انھیں یقین ہو چلا تھا کہ اگر ان کے ہم وطن مسلمانوں نے یہ نہیں کیا تو وہ قعر مذلت سے نہ نکل سکیں گے اور پہلے سے بھی زیادہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

[1] خطوط سرسید، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۱۶۶

باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں

محمد عبدالسلام خاں

کائنات کی علت

کائنات کی علت، وہ مادہ ہو یا اس کی کوئی بدلی ہوئی صورت یا پھر کوئی زیادہ ابتدائی نامعلوم حقیقت ـــــ عقل کی درماندگی، قیاس کی نارسائی اور جستجو کی ناکامی سے بچنے، اتفاق یا حادثہ کہہ کر گزر جاؤ ـــــ ہے بہرحال ایسی بنیادی حقیقت جس کو مانے بغیر نہ انسانی عقل ایک قدم آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ کائنات میں کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

انسانی شعور کی پوری معلوم تاریخ ـــــ چٹانوں پر ہو یا ستونوں اور گپھاؤں میں، زمین دوز مقبروں میں ہو یا مندروں اور محلوں کے کھنڈروں میں، زبانی کہانیوں، گیتوں میں ہو یا پتوں، چھالوں، تختیوں اور کاغذوں میں ـــــ بتسلسل و تواتر گواہ ہے کہ بالادست اور ماوراء قوت کی ہستی کا احساس انسان کی فطرت ہے۔ اگر ہستی خارجی واقعہ ہے تو انسانی شعور کے لئے ایک بالادست طاقت بھی حقیقت اور خارجی واقعہ ہے۔

اس بالادست قوت سے تغافل برت لیا جائے، مبالغہ آمیز دلائل اور ناروا مشاہدات کے بوجھ سے اس فطری احساس کو دبا دیا جائے لیکن اس کو بالکل مٹا دینا بس کی بات نہیں۔ کائنات ہو یا انسانی شعور ایک ماورائی حقیقت دونوں میں رچی بسی ہے۔ نہ کائنات اس سے آزاد ہو کر رہ سکتی ہے اور نہ انسانی شعور اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ کائنات کی یہ فطرت ہے، انسانی شعور کی یہ ساخت ہے۔

کائنات کی علت کے اوصاف اوّلیہ

انفس ہوں یا آفاق اس ماورائی مقتدر اور بالادست طاقت کے کھلے اور واضح علامات سب میں نمایاں ہیں جو پکار رہے ہیں کہ وہ حق ہے "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ"۔ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو خود کائنات کی ہستی تاریک ہو جائے گی۔ عالم کی روشنی اور اس کا نور یہی حقیقت ہے۔ ہستی کی عقلی گواہی اور عملی شہادت یہی ہے۔ "أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝"

موجودات میں یہی سب سے عظیم و کبیر سب سے برتر اور علی و متعال ماورائی حقیقت ہے جو ہستی کے سلسلے کو تھامے ہوئے اور قائم رکھے ہوئے قیوم ہے۔ خود وجود کی نگران اور رقیب، حفیظ، مقیت اور مہیمن ہے۔ قرآن نے اس ظاہر اور کھلی ہوئی حقیقت کو مسلم اور ناقابلِ انکار واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کو خود کسی ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ چیزیں اس کی شہادت کی محتاج ہیں۔ وہ خود بے نیاز اور صمد ہے۔ عالم اس کا ضرورتمند ہے وہ عالم سے بے پرواہ اور غنی ہے۔ یہ حقیقت قوت، علت ـــــ جو بھی نام رکھو ـــــ پوری کائنات کو محیط ہے اتنی واسع ہے کہ اس کی وسعت اور سمائی سے کوئی شے باہر نہیں۔ روزمرہ کے مسلسل اور متواتر تغیرات، تطورات اور شئون کی درپردہ اور باطن علت کے طور پر خود غیر متغیر اور متین ہے۔ یہی سب سے پہلی اور اول ہے، یہی سب سے پچھلی اور آخر ہے یہی وہ یکتا اور احد ہے جو کائنات سے قرین اور قریب ہے۔ لاریب کہ وہ اتنی لطیف ہے کہ اس کو اس کی حقیقی حیثیت میں نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ سب پر فوق اور سب سے غالب ہے۔ عزیز اور سب میں گراں اور گرامی ہے۔ سلسلہ ہستی کی سب سے قوی کڑی اور تمام کڑیوں کی ہستی کی آخری کفیل ہے۔

حیات و ارادہ اور ان کے متعلقات، شعور وغیرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے جہاں تک مذکورہ قرآنی اوصاف کا تعلق ہے اس حقیقت کبریٰ کے تعقل کے لئے لازم ہیں بلکہ اس حقیقت کا انسانی تصور و تعقل کم و بیش یہی اوصاف ہیں۔ انسانی عقل نے جہاں دھوکے کھائے ہیں اور دشواریوں میں الجھی ہے وہ اس حقیقت کی حیاتی خصوصیات، شعور، ارادہ اور اختیار یا کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت اور اس تعلق کی بنیاد پر اس کی

قدیسیات اور تعینات ہیں۔ مذاہب وادیان کا اختلاف بھی اصلاً نتیجہ ہے اس تعلق کی نوعیت اور اس کے تعینات و تقدیسیات میں اختلاف کا فلسفہ و حکمت کی تردید یا تائید کا موضوع حقیقۃً یہی خاص صفات ہیں نہ کہ خود اصل ما ورائی حقیقت۔

قرآن کا اندازِ نظر

قرآن نے انسانی ذہن کے اسی الجھاؤ کو تنبیہوں، توضیحوں اور امثال و واقعات سے سلجھایا ہے اور کائنات اور اس اقتدارِ اعلیٰ کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کی ہے۔ اس نے سامنے کے طبیعیاتی مظاہر سے، ان کی ساخت اور ان کے طبیعی تغیرات سے، ان کے جنچے تلے ٹھیک اندازوں اور تقدیروں سے، ان کی وضعوں سے، ان سے وابستہ فوائد اور مقاصد سے پھر انسانی خلق، اس کے شعور اور آلاتِ حس سے اور اس سے متعلقہ اغراض سے، ان اغراض کے ساتھ فطرت کے لگاؤ اور اس کی موافقت سے واضح کیا ہے کہ کائنات کی آخری علت کو کیسا اور کس طرح کے اسماء و صفات سے متصف ہونا چاہیئے۔ ان موقعوں پر قرآن نے جذبات و میلانات کے بجائے انسان کی عقل و خرد اور اس کے تدبر اور تفکر کو مخاطب کیا ہے اور اس کی علمی حس کو انگیز کیا ہے۔

کائنات اور اس کی عام خصوصیات

انسانی ذہن اپنی تمام موشگافیوں کے باوجود کائنات کی واقعیت سے صرف نظر نہیں کر سکتا فلسفیانہ انتقاد اور علمی مشاہدے کائنات کی خارجیت کے متعلق اس کے رویے میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔ خود انسان اور شعور بھی اسی خارجیت کی ایک کڑی ہے جو پوری کائنات پر حاوی ہے عالمِ انفس اور عالمِ آفاق ایک ہی حقیقت کے مربوط مظاہر ہیں۔ انفس کی ساخت میں آفاق کا شعور شامل ہے اور آفاق کی معنویت انفس کے ساتھ قائم ہے۔ یہ کوئی لمحاتی وجدان یا آنی و قوت نہیں ہے بلکہ ٹھوس اور دیرپا حقیقت ہے۔ "کیا انھوں نے اپنے نفسوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک حقیقت کی حیثیت سے اور ایک مقررہ مدت کے لیے" (پارہ ۲۱ سورہ ۳۰ رکوع ۱)

مظاہر کونیہ کا تشخص اور تعدد، ان کا استمرار اور تغیر، ان میں تعامل اور توالد، ان میں نظم و ضبط کیا اسی لیے نہیں ہے کہ "اس کے یہاں ہر چیز ایک (معین) انداز اور متناسب قدر) کے ساتھ ہے" (۱۳-۱۳-۲) پھر چیزیں نہ خود بخود ہو گئی ہیں اور نہ انھوں نے یہ خاص نسبت اور یہ خاص اندازہ خود بخود حاصل کر لیا ہے "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک اندازہ (اور خاص تناسب) عطا کیا ہے" (۱۸-۲۴-۱)

کائنات کا سادہ سے سادہ عنصر ہو یا نہایت پیچیدہ اور ترقی یافتہ ترکیب، اس کی فطری ساخت نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ ممکن حد تک تام ہے بلکہ اپنی پوری مدت بقا اور تمام اطوارِ وجود میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو اعمال اور استعدادیں لابد ہیں ان میں بھی مکمل ہے، گردو پیش سے ساز کرنے کے لیے صلاحیتیں درکار ہیں ان میں پوری اور حسن آفرینش کا نمونہ ہے۔ تو کیا مظاہر کا کمال کی طرف یہ رخ خود بخود ہو گیا ہے۔ یہ نظام تعاون و تعامل خود وجود میں آگیا ہے۔ ہم آہنگی اور تواخی کی طرح چیزیں اپنے آپ ہی اپنے آپ بڑھ رہی ہیں۔ کیا اس کے لئے اندرونی ساختوں، ان کی الگ الگ خصوصیتوں، بیرونی صورتوں اور ان کے جدا جدا اعمال و وظائف اور قریب و بعید گردو پیش، باہم تعامل اور گزشتہ و آئندہ اثرات کا گہرا اور وسیع علم ضروری نہیں ہے؟ اسباب و علل پر کامل اقتدار درکار نہیں؟ موافقانہ رویہ یا رحمت لابد نہیں؟ قرآن کہتا ہے: "وہ جاننے والا ہے چھپی (اور پس پردہ حوادث و اندرونی حقائق) اور کھلی کا۔ غالب (اور با اقتدار) ہے۔ رحمت (اور شفقت) والا ہے جس نے ہر اس چیز کو جس کو پیدا کیا ہے، اچھا ہی بنایا ہے" (۲۱-۳۲-۱) اس اندازِ صنعت اور اس طرزِ آفرینش اور اس نظامِ تعاون کے سطحی علم اور اتھلی دانائی کافی نہیں۔ معمولی زور اور قوت مفید نہیں محروم اور غیر جانبدارانہ رویہ بس نہیں۔

طبیعی مظاہر کا تجزیہ کرتے چلے جاؤ، اجزاء کی خصوصیتوں پر نظر رکھو، ان کے فاصلوں کا جائزہ لو پھر تعامل پر غور کرو۔ محدود عناصر اور ان گنت مرکبوں کو دیکھو، سالموں کے اختلاف اور ان کے جواہر کی یکسانی پھر کمیتی فرقوں کو، برقیوں کی تعداد اور ان کے عددی اختلاف کے اثرات سب پر نظر ڈالو، ان کی تالیفوں اور ان تالیفوں کی بندش کے فرقوں کا لحاظ کرو پھر ان فرقوں پر مبنی خصوصیات کا مشاہدہ کرو اور پھر ترکیبی استحکام اور بندش کی چستی کی توجیہ کرو۔ کیا عقل سلیم باور کرتی ہے کہ ناپیوستہ سالمات میں اپنی اپنی جگہ رہنے کی خواہش ذاتی ہے۔ برقیے اپنے آپ ہی آپ اپنی تعداد مقرر کر لیتے ہیں اور محکم اور سخت بندش وجود میں آجاتی ہے اور اس طرح یہ مختلف النوع طبیعی اصناف نمودار ہو جاتے ہیں یا اس سب میں کسی علم و حکمت والی با اقتدار ذات کی

صنعت گری جلوہ فرما ہے۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ نظامِ ہستی کی یہ حسینی، مظاہر میں یہ حسن انتظام اور موجودات میں یہ متین تعامل کی کارفرمائی ہے۔ "اس ذا
کی جس نے ہر شے کو متانت (اور حسینی) عطا کی ہے" (۲۰-۲۷-۷)

اب اگر کائنات محض دھوکا اور فریب نہیں ہے تو پھر اس کا حقیقی ہونا، اس کے طبعی مظاہر میں خاص اندازوں اور قدروں کا کارفرما ہونا، ان کا
آفرینش اور حسنِ خلق، ان کی متانت اور استحکام، نظم و ضبط عقلِ سلیم کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ وہ فلسفیانہ دوراز کار احتمالات اور عقلِ نظری کے کھوکھلے امکا
کے پرفریب جال میں پھنسے بغیر واقعاتی بصیرت سے کام لے اور علمی فیصلہ کرے کہ اس کارزارِ ہستی اور کارزارِ حیات میں بے بصیرت اسباب و علل اور اندھے طب
عوامل آپ ہی آپ فعال اور موثر ہیں یا ان کا انتخاب و اختیار پھر ان کی باگ ڈور علیم و حکیم اور مصلحت شناس مقتدر کے ہاتھ میں ہے۔

اجرام ارضی و سماوی کی خلق اور ان کی نوعیت

کائنات کے سب سے بڑے طبیعی مظاہر ارضی و سماوی اجرام جن کی عظمت
ہیبت نے دنیا کی بڑی بڑی قوموں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر
تھا اور جن کے فرضی کارناموں کی دیومالائیں بن چکی ہیں، ان کی ابتداء یہ ہے کہ سماء (یا اجرام سماوی) تو "دھواں (یا گرم گیس) تھا۔ چنانچہ اس سے اور ز
کہا کہ بخوشی یا بجبر وجود میں آ جاؤ انھوں نے کہا ہم بخوشی آگئے تو ان کو سات سماوات کر دیا" (۲۴-۲۱-۲) یہ عظیم ترین گیسی مخلوق جس کی شان یہ تھی
ارض و سموات خلط ملط (اور ملی جلی وحدت) تھے (۱۷-۲۱-۳) ان کو خاص قدروں اور صحیح ترین اندازوں سے "اب الگ الگ کیا" (۱۷-۱
اور خاص خاص حجموں کے اجرام میں اس طرح تشکیل کیا کہ ایسا نظام گرفت بروئے کار آ گیا کہ "ارض و سماء (محض) اس کے حکم سے قائم ہیں" (۲۱-۳۰
اور دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ "اللہ وہ ہے جس نے سماوات کو ایسے ستون کے بغیر اٹھائے رکھا ہے جس کو دیکھ سکو" (۱۳-۱۳-۱) چنانچہ یہ اج
اپنی ساخت طریقِ ساخت بلکہ اپنے مادے میں بھی یکساں ہیں "اللہ وہ ہے جس نے سموات سبعہ کو مطابق (اور یکساں) بنایا[1]" (۲۹-۶۷-۱

اس معلوم نظامِ ہستی کی سب سے بڑی عظیم الشان مخلوق اجرام سماویہ کی ابتدائی شکل پر غور کرو۔ ابھی نہ سورج ہے نہ چاند، نہ زمین ہے ا
بالائی فضا دھند ہے جو لامحدود خلا کے کسی گوشے یا حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ گرم گیس ہے جو کسی خاص وسعت میں بھری ہوئی ہے۔ کیا لاشے محض نے آ
ہی آپ شے کا روپ دھارن کر لیا یا کوئی نامعلوم شے از خود دھوئیں یا گرم گیس میں تبدیل ہو گئی؟ پھر اس گیس میں منضبط تغیرات کیوں کر پیدا ہو
شروع ہو گئے؟ ٹھیک نظم کے ساتھ صحیح اندازوں کے ساتھ یہ خود بخود تقسیم ہو گئی۔ اور پھر الگ خصوصیتوں والے اجرام وجود میں آ گئے اور ایک نہایت دقیق
اور ہم آہنگ نظام وجود بروئے کار آ گیا؟ زمین کو اجرام سماویہ کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اور ان کی گوناگوں ہلاکت بار فعلیتوں کو منف
کرنے کے لیے بالائی فضا تیار ہو گئی اور اس نے زمین کو لپیٹ لیا۔ قرآن کہتا ہے "ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنا دیا ہے" (۱۷-۲۱-۳۲) دوسری ج
ارشاد ہے "کیا انھوں نے دیکھا نہیں اپنے اوپر آسمان کی طرف ہم نے اسے کیسا بنا دیا ہے" (۲۶-۵۰-۱) کیسا بنا دیا ہے؟ "اللہ تو وہ ہے جس نے
کو مستقر اور آسمان کو گول گھر بنا دیا ہے" (۲۴-۴۰-۷) اس گول گھر میں تحفظ کا جو سامان ہے وہ تو ہے ہی، ساتھ ساتھ جمالیاتی نقطۂ نظر سے ستاروں

---

[1] عام اور مشہور معنی تو وہی ہیں جس کو لسان میں بیان کیا گیا ہے والسموات الطباق سمیت بذلک لمطابقۃ بعضہا بعضا
بعضہا فوق بعض وقیل لان بعضہا مطبق علی بعض، لیکن اوپر نیچے ہیں یا ایک دوسرے پر ڈھکے ہوئے اور چھائے ہوئے ہیں سب
رویت یا ممکن نہیں ہے یا بہت مستبعد ہے۔ حالانکہ "ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت" ای الاختلاف من الفوت فان کلا من المتف
تین فات عنہ بعض ما فی الآخر۔ اور ھل تریٰ من فطور، والفطور الشقوق، میں رویت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یکسانی
تفاوت زیادہ مناسب ہے۔ مطابقۃ اصلاً اگرچہ مقدار اور پھیلاؤ کی مساوات ہے لیکن دوسری طرح کی برابریوں میں بھی اس کا استعمال متعارف
لسان میں ہے:-

المطابقۃ الموافقۃ، والتطابق الاتفاق، وطابقہ علی الامر جامعہ واطبقوا علی الشیئ اجمعوا علیہ
ویقال طابق فلان فلانا اذا وافقہ وعاونہ مطابقت المرأۃ زوجہا اذا واتتہ

ت اور آرائش کا سامان ہونے میں بھی نچلی فضا کو کتنا دخل ہے جاننے والے جانتے ہیں۔" ہم نے سب سے نچلے آسمان کو چراغوں سے مزین کر دیا ہے اور
اتھ ساتھ) حفاظت کے لئے" (بھی) (۲-۴۱-۲۴) تو کیا یہ سب کچھ محض طبیعی حادثہ ہے۔ بے شعور مادے کے از خود تغیرات ہیں۔ صرف طبیعیاتی
یت ہے یا اس میں کوئی گہرا علم، وسیع دانائی اور غیر معمولی اقتدار پنہاں ہے جس کو قرآن کہتا ہے:۔" ذالك تقدير العزيز العليم ٥"
نچہ کتنی ہی گہری، کیسی ہی دقیق علمی نظر ڈالو اس خلق میں فرق نہیں پاؤ گے۔ بار بار تجربے کرو۔ نازک سے نازک آلات کی مدد لو لیکن اختلال اور نقصان
راغ نہیں لگا سکو گے اور آخر میں تمہاری خوردہ گیر نظر کو ناکام ہونا پڑے گا اور عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا ہوگا۔

مین چاند اور سورج

یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کائنات کی آخری علت کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ اور کیا علم و حکمت سے تہی مایہ، اقتدار و اختیار سے بے بہرہ ہستی اس کارگاہ وجود کا نقشہ مکمل کر سکتی ہے؟ زمین، چاند اور سورج پر، جو حیات پر براہ راست
ز ہیں، نظر ڈالو۔ دیکھو اللہ "وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔ اور اس میں گڑھے (پہاڑ) بنائے اور دریا بہائے" اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے
ا (نر و مادہ) مہیا کیے" (۱۳-۱۳-۱) پھر اس میں ہر طرح کے چوپائے پھیلا دیئے" (۲۱-۳۱-۳) اب زمین کا یہ انداز کہ وہ ذی حیات کا مسکن ہے،
نات کا لہلہاتا چمن اور فلک بوس پہاڑوں کی بیٹھک ہے، دریاؤں کا رستہ اور سمندروں کا فرش ہے نظر میں رکھ کر سورج اور چاند کی حیات آفرینی
غور کرو اور سوچو کہ ان کی منظم اور منضبط حرکات کی کیا اہمیت ہے خصوصاً جبکہ خود "سورج اپنے ایک مستقر (اور مقام) کی طرف رواں ہے (۲۳-۳۶-۳)
ن واضح کرتا ہے کہ" چاند کی منزلوں کا ہم نے انداز مقرر کر دیا ہے کہ وہ پرانے خوشے کی صورت (باریک اور خمیدہ شکل میں) پلٹ آتا ہے۔ نہ
رج کو سزاوار ہے کہ وہ چاند کو آ لے اور نہ رات دن پر چھا لے اور سب (اپنے اپنے) فلک (اور مدار) میں رواں رہتے ہیں" (۲۳-۳۶-۳)
ں حرکات یا ان اجرام کے فاصلوں میں فرق پڑ جاتا تو کیا یہ ارضی مسکن باقی رہ سکتا تھا۔ اس کی حیات آفرینی، اس کی یہ سرسبزی اور یہ رونق باقی رہ سکتی
ں۔ قرآن نے بار بار زور دیا ہے کہ" سورج اور چاند حسابی اندازے کے ساتھ ہیں" (۲۷-۵۵-۱) زمین کی حیات آفرینی اس کی روئیدگی اور اس
ارونق میں سورج اور چاند کی حرکتوں، روشنیوں اور شعاعوں کو کتنا دخل ہے۔ زندگی سے عام ہم آہنگی میں ان اجرام کی خصوصیتوں اور ان کے مقررہ
مال و افعال کو جو تعلق ہے اس کو محض طبیعیاتی اتفاق کہہ کر گذر جانے سے مسئلے کی اطمینان بخش توجیہ ہو جاتی ہے۔ یا سچ مچ یہ سب کسی جانے بوجھے
صوبے کی مقررہ کڑیاں ہیں اگر ہیں تو پھر اللہ "وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور کیا ہے اور اس کی منزلیں مقرر کی ہیں" (۱۱-۱۰-۱)
ں بھی تو ہو سکتا تھا کہ بالائی فضا روشنی کی روک بن جاتی، زمین کا فقط کوئی ایک ہی رخ سورج کے سامنے رہتا، وہ زیادہ حرارت جذب کرتی،
مندر تعدیل نہ کرتے، چاند مدوجزر نہ لاتا۔ چنانچہ یہ شب و روز کا تعاقب اور سورج اور چاند کی یہ خاص فعلیت غور کرنے کی چیزیں ہیں۔
یا دیکھا نہیں کہ اللہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے۔ اور دن کا رات میں دخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر دیا ہے" (۲۱-۳۱-۳)
وسری جگہ ارشاد ہے:" اور وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب اپنے (اپنے) فلک (مدار) میں تیرتے رہتے
یں" (۱۷-۲۱-۳) ایک جگہ کہا گیا ہے:" روز و شب کے اختلاف (اور تعاقب) اور آسمانوں اور زمین میں جو پیدا کیا ہے، ایسی قوم کے لیے جو ڈرتی ہے،
شانیاں ہیں" (۱۱-۱۰-۴)

نسانی حیات اور اس کی نشو و نما کے وسائل

زمین و آسمان کو ایک دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھو کہ یہ، ان کی مختلف فعلیتیں اور ان سے وابستہ دوسرے گوناگوں مظاہر اتفاقی حادثے
و بے مقصد طبیعی آثار ہیں یا کسی اہم اور برتر مخلوق کی زندگی اور اس کی نشو و نما کی صلاحیت کا بھی کسی نہ کسی درجے میں لحاظ ہے:" اور ہم نے زمین و
سمان کو اور جو کچھ اس میں ہے کھیل بنا کر (اور بے مقصد) نہیں پیدا کیا ہے" (۱۷-۲۱-۲) کا بھی عملی ثبوت ہے۔ زمین کو ایسی وضع دی گئی کہ وہ
مام قسم کے ذی حیات خصوصاً انسان کا مسکن ہونے کی بھرپور استعداد رکھتی ہے:" وہ تو وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی حیثیت دی"
(۱-۲-۴) پھر اس میں زندوں اور مردوں سب کی گنجائش رکھی:" کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردہ سب کے لئے جامع نہیں بنایا ہے" (۲۹-۷۷-۱)
اس کے کوئی سلسلوں کو دربند نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ آمد و رفت کو جاری رکھنے اور باہم تعلقات کو قائم کرنے اور آپس کے میل جول کو جاری رکھنے اور

باہم تعلقات کو قائم کرنے اور آپس کے میل جول کو جاری رکھنے کے لئے ان میں درّے اور رستے کھلے رکھے۔ "اور ہم نے ان میں درّے بنا دیئے ہیں رستے کے انداز پر کہ وہ راہ پا سکیں۔" (۱۷-۲۲-۳) اس کے سمندروں کو قابل عبور بنایا اور جہاز رانی اور کشتی بانی کی سہولتوں سے انسانوں کو نوازا "کیا دیکھا نہیں کہ سمندر میں کشتیاں اللہ کی نعمت (و کرم) سے چلتی ہیں۔" (۲۱-۳۱-۴) پھر بری اور بحری سفروں کو سہل بنانے کے لیے ستاروں کے طلوع و غروب اور ان کی حرکتوں کو ایسا انداز دیا کہ لق و دق بیابانوں میں حدود نظر سے زیادہ وسیع سمندروں اور سمتوں کی دریافت کا ذریعہ بن گئے "اور وہ تو وہ ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا کہ تم بر و بحر کی تاریکیوں میں رستہ پا سکو۔" (۷-۶-۱۲) ساتھ ساتھ "آسمان کو محفوظ چھت بنا دیا ہے۔" (۱۷-۲۱-۳) تاکہ بالائی اجرام کی ہلاکت باریوں سے یہ کرۂ ارض محفوظ رہے اور جہاں تک مفید اثرات کا تعلق ہے وہ برابر پہنچتے رہیں۔ موسموں کے ایرپھیر سے حیات آفرینی اور اس کی مناسب نشو و نما کا انتظام ہو۔ حیات ارضی کی بقا کے لیے اس کی ضرورتوں کے پورا ہوتے رہنے کا سامان کیا۔ غذاؤں کا بندوبست کیا، وسائل معیشت مہیا کیے اور ایسی کروڑوں مخلوق کی بقا کے سامان فراہم کیے جو انسانی حیات کے لئے ضروری ہونے کے باوجود ان کا تغذیہ انسانی دسترس سے باہر ہے۔" اور ہم نے اس میں اگائیں ہر طرح کی موزونات (غلوں کی قسم سے) اور ہم نے اس میں تمہارے معیشتوں (کے وسائل) کو پیدا کیا اور ان کے لیے (بھی) جن کو تم رزق نہیں دیا کرتے۔ اور کوئی ایسی شے نہیں مگر ہمارے پاس تو اس کے خزانے ہیں اور ہم انہیں اتارتے نہیں ہیں مگر ایک معین (اور مناسب) انداز سے۔" (۱۴-۱۵-۲) خشک اور ایک طرح سے مردہ دانوں اور تخموں میں تولید مثل کی قابلیت پیدا کر کے زرعی اور باغبانی نظام کی طرح ڈالدی "یہی تو ہے کہ اللہ چیرنے والا ہے دانے اور گٹھلی کا کہ زندہ کو مردے سے نکالنے والا اور مردے کو زندہ سے۔" (۷-۶-۱۲) زمین کے تمام قطعوں کو یکساں نہیں بنایا بلکہ سب ہی کچھ کچھ فرق رکھے گئے اس طرح ان کی صلاحیتیں الگ الگ ہو گئیں۔ کچھ زراعت اور اس کی مختلف اصناف کے لئے مخصوص ہیں تو کچھ میں باغوں کو نشو و نما دینے کی استعداد ہے کچھ سبزہ زار بننے کی اچھی قابلیت رکھتے ہیں اور اس طرح انسانی حیات اور اس کے لوازم و مناسبات کے لئے زیادہ بہتر وسیلے کا کام دیتی ہے۔" اور زمین میں ملے جلے قطعے ہیں انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں اور نخلستان ہیں۔" (۱۳-۱۳-۱) پھر درختوں، پودوں اور کھیتوں کی سیرابی کے لیے بارش کا انتظام۔ "کیا دیکھا نہیں کہ اللہ چلاتا ہے ابر کو پھر اس کو جوڑتا ہے پھر تہ بہ تہ کر دیتا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ بارش اس سے نکلنے لگتی ہے۔" (۱۸-۲۴-۶) پھر اس وقتی آب رسانی کے ساتھ ساتھ سیرابی کے لئے مستقل انتظام کیا۔ پانی کو محفوظ کر کے چشموں اور دریاؤں کی صورت میں اس کا ذخیرہ رکھنا اور تقسیم کرنا ایک جانے بوجھے نظام کا پتہ نہیں دیتے۔ "کیا دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان (اوراوپر) سے پانی اتارا پھر زمین میں چشموں کی صورت اس کو رواں کیا اب اس سے اقسام کی کھیتیاں ابھر آتی ہیں۔" (۲۳-۳۹-۲) نقل و حمل کو سہل بنانے میں، غذائی ضرورتوں میں کام آنے میں، پیداوار کو بڑھانے میں، ڈھور ڈنگروں کا اہم حصہ ہے (۲۳-۳۶-۵) چنانچہ اس زاویہ نظر سے ان کی خلق انسانی نظام حیات کا ہی ایک جزء ہے اور قرآنی تصریح کے مطابق سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے نشانی ہے (۲-۲-۳۰)

غرض یہ کہ کرۂ ارضی کا اپنی صلاحیت، اپنے تحفظ، اپنے موسموں اور آب و ہوا اور دوسرے مظاہر کے اعتبار سے پھر اپنی پیداوار اور ذخائر کے اعتبار سے زندگی سے خصوصاً انسانی زندگی سے موافق ہونا لاریب طبیعی اسباب کا مرہون ہے لیکن ان کثیر طبیعی اسباب کا اور گوناگوں علتوں کا یکجا اور ایک وقت فراہم ہو جانا اور وہ بھی پوری ہم آہنگی کے ساتھ محض اتفاقی حادثے سے جس کے پیچھے کوئی شعور اور ارادہ نہیں، ایک کھوکھلا عقلی امکان ہے اور بس۔

انسان کی پیدائش اور اس کے آلاتِ حس

کرۂ ارض کی سب سے برتر، بہتر اور سلسلۂ ارتقا کی سب سے پیچیدہ اور آخری کڑی انسان ہے اس کا غیر معمولی تعادل اور توازن، اس کے آلات حس و ادراک کی بے مثال پیچیدگی اور نزاکت اور مختلف و متخالف ظروف سے ساز کر لینے کی اہلیت غرض یہ کہ اپنی مجموعی حیثیت میں یہ حیاتی ارتقا کا شہ کار دعوت فکر ہے ان سب کے لیے جو کائنات کو محض اتفاقی حادثہ منوانے اور تنہا طبیعی قوتوں کا دقتی تعامل تسلیم کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ پہلے صرف ایک طبیعی مظہر کی حیثیت میں قدرت کی اس نادرہ کاری پر نظر ڈالیں ابتدائے آخر تک اس کے شئون اور تطورات

کو دیکھیں، اس کے مدارج خلق اور مراحل حیات پر غور کریں" اور خود تمہاری آفرینش میں .... نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین (کی دولت) رکھتے ہیں" (۵۱-۲۰-۲۱) اس باحیات اور حیات آفریں، اس باشعور اور شعور زا "انسان کی آفرینش کی ابتدا (بے جان اور بے شعور مادے یا) گارے سے کی ہے۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی (یا مردانہ رطوبت) میں کے خلاصے[1] (یا تخم) سے بنایا پھر اس کو برابر (اور درست) کیا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا" (۳۲-۷-۹) یہ انسانی ہمواری اور تسویہ یک بارگی اور دفعتاً نہیں ہوا بلکہ متعدد و مستقل صورتوں کے درجہ بدرجہ ارتقائے انسان نے یہ مناسب اور متوازن صورت اختیار کی ہے پھر یہ ارتقا کھلی اور روشن فضا میں نہیں ہوا ہے بلکہ شکم مادر کی اندھیری کوٹھری میں، رحم مادر کی بند تھیلی کے اندر، پہلے بیضہ مادری کی جھلی میں اور پھر دیوار رحم کے منہ بند سوراخ میں اور آخر میں مشیمے اور جرثومی جھلی کی اندھیاری[2] میں۔ ساتھ ساتھ نشو و نما کے ہر مرحلے اور ہر ظرف و مقام کے مناسب خلق کے انداز بدلے۔ "تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے تین تاریکیوں میں، یکے بعد دیگرے (انداز) آفرینش سے" (۳۹-۶) چنانچہ نطفے[3] (یا باردار بیضۂ مادری) کے اندر کے ضروری تغیروں کی تکمیل کے اثنا میں یہ جنینی مادہ بہتا ہوا اور آخر میں اس بیضوی جھلی کو توڑتا ہوا دیوار رحم کی جھلی کو کاٹ کر تدریجاً اس سے متعلق اور اس میں جم جاتا ہے اب علقے[4] یا جنین (Embryo) کی صورت میں مناسب نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ارتقا کے ایک خاص اور اہم مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور پہلے غیر متمیز اور نا تمام مضغہ یا جسد اور پیکر (Foetus) کی شکل لے لیتا ہے۔ اول اول خاص خاص اعضا کی علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوتی ہیں یہاں تک کہ درجہ بدرجہ تمام اعضا صورت پذیر ہو جاتے ہیں[5]۔ اور یہ انسانی پیکر بچہ اور طفل ہو کر سات قمری مہینوں میں ہی یا پھر مزید قوت و کمال حاصل کر کے کم و بیش دس قمری مہینوں میں انسانی برادری کے اضافے کا باعث ہو جاتا ہے۔ "ہم نے تو تمہیں مٹی (اور بے جان مادے) سے پیدا کیا تھا۔ پھر نطفے سے پھر علقے سے پھر تام اور نا تمام لوتھڑے سے تاکہ (ان عجیب و غریب مراحل آفرینش سے) تمہارے لیے (اپنے آپ کی) تشریح کر دیں اور ہم تمہیں ارحام (مادر) میں جب تک چاہتے ہیں (تاہم) معین مدت کے لیے رکھتے ہیں۔ پھر بچے کی حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر بچے کی حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر (یہ نشو و نما جاری رہتی ہے) کہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ[6] (۲۲-۵) اب کی موجودہ شکل و صورت پر

---

[1] لسان العرب میں ہے: "السل انتزاع الشیء واخراجہ فی رفق .... سلالۃ الشیء ما استل منہ" من سلالۃ من ماء میں دوسری "من" غالباً ابتدا کے لیے ہے۔ واللہ اعلم

[2] تقریباً دس گیارہ دن میں مادۂ تولید یا نطفہ بیضۂ مادری کی جھلی میں بند بہتا ہوا دیوار رحم تک پہنچ جاتا ہے اور پھر جھلی توڑ کر دیوار رحم میں تدریجاً سرایت کر کے علقہ کی صورت میں استقرار پا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مشیمے (Chorion) کے اندر جرثومی جھلی (Amnion) پھیل کر جنین کو لپیٹ لیتی ہے۔ اس طرح شکم مادر کے اندر رحم، مشیمہ اور جرثومی جھلی کی تین تاریکیوں میں جنین جسدی انداز (پہلے غیر مخلقہ یا نا تمام مضغے اور پھر تام اور مخلقہ مضغے کی شکل میں) اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

[3] لسان العرب میں ہے: "النطف الصب .... و نطفان الماء سیلانہ"۔ گویا باردار بیضے پر نطفے کا اطلاق اس کی اس بہاؤ اور سیلان کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔

[4] علق بالشیء علقا و علقۃ: نشب فیہ و علق الشیء علقا و علقا و علق بہ علاقۃ و علوقا لزمہ لسان العرب کی اس تصریح کے بموجب علقے میں تعلق، سرایت کرنے اور استقرار پا جانے کا مفہوم شامل ہے۔

[5] اذا صارت العلقۃ التی خلق منہا الانسان لحمۃ فہی مضغۃ (لسان العرب)

یوں پہلے مضغۂ غیر مخلقہ اور پھر مخلقہ نا تمام اور تام لوتھڑے کی شکلیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ مخلقہ کو مقدم کرنے میں اس کی مثبت حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہے تاکہ منفی غیر مخلقہ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ ترتیب کو سامع کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

[6] ایک دوسرے موقعے پر مضغے یا جسد اور پیکر (Foetus) کے دوسرے اندرونی تغیرات کو بیان کیا ہے کہ مضغے میں پہلے (ابتدائی غضروف پر)

نظر ڈالو۔ دوسری ذی حیات مخلوق سے مقابلہ کرو تو تم اس کو قدرت کی صناعی کا آخری نمونہ پاؤ گے اور اس واضح سچائی کو ماننے پر مجبور ہو جاؤ گے "تمہیں صورت عطا کی تو بہتر صورتیں بنائیں۔" (۲۴-۴۰-۷) اس کے تعادل اور توازن کو دیکھو، اس کے عواطف و میلانات کا جائزہ لو، اس کے ادراکات و حیات پر نظر ڈالو تو اس کو اس کی ساخت اور ترکیب کے اعتبار سے کرۂ ارضی کی سب سے برتر مخلوق پاؤ گے اور باور کر لو گے کہ "یہی تو ہے کہ ہم نے انسان کو (ساخت اور) تقویم کے اعتبار سے بہترین بنایا ہے۔" (۳۰-۹۵-۱)

انسان یوں تو اپنی مجموعی حیثیت میں ارتقاء کا آخری نشان ہے ہی تاہم جن لوگوں نے جدید انکشافات کو سامنے رکھ کر انسانی سماعت بصارت اور دماغی قوتوں پر غور کیا ہے، ان کی پیچیدہ، نازک صنعت اور ان کے عجیب و غریب اعمال اور خارجی آثار کے وصول، امتیاز اور پھر ان کی تقسیم اور درجہ بندی پھر ان کے ایصال اور تاثیر پر غور کیا ہے، ان کو فطرت کا غیر معمولی کمال اور قدرت کا نادر عمل قرار دیا ہے قرآن نے بھی خاص طور سے ان آلات کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ہے "اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور افئدہ (یا دل و دماغ) بنائے۔" (۲۱-۱۰-۴) عام مشینی آلات یا خالص طبیعیاتی آثار کی طرح یہ آلات ابتدا سے ہی مکمل نہ تھے بلکہ ایک متواتر تدریج ہے خامی سے پختگی کی طرف، ایک مسلسل ارتقاء ہے ضعف سے قوت کی طرف "اور اللہ نے تمہیں شکم مادر سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل (یا دماغ) بنائے" (۱۴-۶-۱۱)

انسان کے اس کمال کی بلندی پر پہنچنے میں اس کے معلومات، محسوسات، جذبات اور عواطف کے نہایت صحیح طور پر منتقل ہونے کو بہت بڑا دخل ہے جس کا سب سے کامل اور بڑا ذریعہ قوت بیانی ہے۔ اگر آدمی اپنے معلومات دوسروں تک ٹھیک ٹھیک نہ پہنچا سکتا ہوتا۔ اپنے محسوسات سے دوسروں کو باخبر نہ کر سکتا ہوتا، اپنی خواہشیں دوسروں پر نہ پیش کر سکتا ہوتا تو کیا انسانی معاشرہ ایسا ہی ہوتا جیسا ہے اظہار مافی الضمیر کی یہ انسانی قوت اس کی عجیب و غریب ساخت کا قابل لحاظ حصہ ہے چنانچہ قرآن نے اس کی اس قوت کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے "اس نے پیدا کیا انسان کو اور اس کو (اپنے مافی الضمیر کو واضح کر دینا سکھایا۔" (۲۷-۵۵-۱) چنانچہ بحیثیت مجموعی انسان کے اس عجیب و غریب ظہور کو، اس کے ان غیر معمولی تطورات کو، اس کے ان پیچیدہ آلات حس و ادراک و اظہار کو اس پیکر حسن و جمال کے تعادل اور توازن کو، اس کی نادرہ کار صلاحیتوں، اس کی بے مثال فعلیتوں کو محض بے شعور طبیعی عوامل کی تاثیر کا اتفاقی کارنامہ کہنا آسان ہے یا ایک باشعور، با اقتدار اور بامقصد خلق کا شاہکار قرار دینا۔

انسانی ارتقاء اور معاشرتی ارتفاع کے وسائل

انسانی حسن و صورت اور حسنِ ساخت پر ہی اکتفا نہیں کر دیا بلکہ اس میں جو عقلی اور عملی قوتیں ودیعت ہیں ان سے کام لینے کے لیے ایک میدان بھی مہیا کیا گیا ہے اور اس طرح نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کرنے کے لئے اس کو ایک کھلی فضا فراہم کر دی گئی اس کو عمل اور تجربے کی کامل آزادی ہے۔ ان گھڑ اور خام مواد کی بھرپور فراوانی ہے۔ ساری کائنات اس کا معمل اور تجربہ گاہ ہے۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ سب مسخر کر دیا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتوں کی تم پر تکمیل کر دی ہے۔" (۲۱-۳۱-۳) زمین کی ہر شے اس کے عمل اور تجربے کے لئے آلہ اور وسیلہ ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس سے کام لے اور کائنات کی رہی سہی ناآہنگیوں میں آہنگ پیدا کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کی شہادت بہم پہنچائے۔ "اور وہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے ان سب کو پیدا کر دیا ہے جو زمین میں ہے۔" (۱-۲-۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) استخوانی ڈھانچ متمیز اور ظاہر ہونے لگتا ہے اور اس تمیز اور ظہور کے بالکل عقب میں ہی اس ڈھانچ پر گوشت کا چڑھاؤ اور لپیٹ نمایاں ہونی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہڈیاں ڈھک جاتی ہیں" اور ہم نے تو انسان کو پیدا کیا ہے (مادے یا) گارے کے جوہر سے، تو پھر اس کو قائم اور رکھے ہوئے) ٹھکانے میں نطفہ بنا دیا پھر نطفے کو علقہ بنایا اب علقے کو مضغہ دیا بیکس بنایا اب مضغے کو ہڈیاں کیا اب ہڈیوں پر گوشت پہنایا۔ پھر اسکو دیا کل، دوسری طرح (اور نئے انداز) پیدائش دیدی تو برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر خالق (۱۸-۲۳-۱)

انسان کی اس فطری ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے جس مضبوط اجتماع اور محکم تعاون کی ضرورت ہے اس کو بروئے کار لانے کے لیے جو جذباتی کشش ادبے انسان کو اس کا بھی وافر حصہ دیا گیا ہے۔ "اور تمہارے آپس میں محبت اور شفقت پیدا کی۔" (۲۱-۳۰-۳) ساتھ ساتھ اس کی انفرادی راحت و آرام اور گھریلو سکون و دل جمعیت کے جو سامان تھے ان کو بھی پوری فراخی سے مہیا کیا۔ "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی میں سے جوڑ پیدا کیے کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو۔" (۲۱-۳۰-۳) "اور ہم نے تمہیں جوڑے پیدا کیا، تمہاری نیند کو راحت بنایا اور رات کو ستر بنایا اور دن کو گذر بسر کے لیے بنایا۔" (۳۰-۸-۱) "کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی میں سے ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے۔ اب وہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے ان کو ان کا مطیع کر دیا ہے۔ ان سے ان کی سواریاں ہیں اور ان سے کھانے (بھی) ہیں اور ان کے لیے ان میں منفعتیں ہیں اور (دودھ) پینے کے موقعے ہیں۔" (۲۳-۳۶-۵) غرض یہ کہ ہر طرح سے انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جو قدرتی ذرائع اور مادی وسائل مناسب اور ضروری تھے وہ سب موجود ہیں۔

چنانچہ یہ انسانی صلاحیتیں اور تعلیتیں پھر ماحول کی ان کے ساتھ یہ قدرتی سازگاری کیا مقصدیت کی طرف رہنمائی نہیں کرتی؟ کیا محض بخت و اتفاق انسانی تکوین کی مکمل توجیہ ہے؟ کیا حادثے مقصدیت کی تعلیل کے لیے کافی ثابت ہو سکتے ہیں؟ پھر ان توجیہوں سے عقل سلیم بھی طمانیت اور تسکین حاصل کر لیتی ہے؟

کائنات کی علت کا حیات و شعور اور انکے لوازم و مناسبات سے موصوف ہونا

کائنات کے حقیقی ہونے، اکمل اور منظم و منضبط کے اعتبار سے محکم ہونے سے، اس کے مظاہر کی طبیعیاتی تاریخ اور ان کے مواد، ان کی اوضاع اور ان کی حرکات کی ٹھیک ٹھیک مقررہ تقدیروں، اندازوں اور ان کے آہنگ سے اور ان سب کے ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ سے پھر خصوصیت سے انسان کی طبیعی تاریخ اور اس کے ترقی یافتہ آلاتِ حس و ادراک سے، اس کے لئے وسائل حیات کی حیات کی فراہمی سے، اس کی صلاحیتوں اور ان صلاحیتوں کے لیے میدانِ عمل کی بہم رسانی سے اور دوسری قدرتی سہولتوں سے قرآن نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ کائنات کے سبب اور علت کا نہ صرف یہ کہ خالق، باری، مصور ہونا کافی ہے بلکہ اس کو حی اور زندہ حقیقت کے تمام اعلیٰ اوصاف مرید، علیم، خبیر، سمیع، بصیر، حکیم اور مدبر سے موصوف ہونا چاہیے۔ کائنات کا ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ اس کے بغیر قابل فہم نہیں کہ اس کا خالق اس کا رخ متعین کرنے والا اور ہادی ہے۔ انسان کے ساتھ کائنات کا یہ تدریجی آہنگ اور ساز کیسے ہو سکتا ہے اگر نوعی نظریہ پر قاہر اور قہار ذات کا رویہ رحیم، رؤف بلکہ ودود کا سا نہ ہو۔

کیا انسانی شرف و مجد، اس کے میدان عمل کی وسعت، اس کے اقتدار کے پھیلاؤ کا یہ تقاضا نہیں کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر شے کی طرف اس کا زاویہ نظر بجائے انفعالی ہونے کے فعلی ہو، اور حیرت سے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بدلے ان سے کام لینے کی کوشش کرے طبیعی قوتوں کو اپنا خادم سمجھے اور تنہا اسی ذات کو جو قدیر اور فعّالٌ لِمَا يُرِيد ہے، اپنا مولیٰ، رب، ولی، نصیر اور رزّاق محسوس کرے۔ اس کی نیابتی صلاحیتوں کو ابھارنے اور خلافتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جس استغنار، بے باکی، آزادی، اعتماد نفس، تحمل، تنافس اور مساوات وغیرہ اوصاف کی ضرورت ہے اُن کو پیدا کرنے میں اس کا یہ احساس ممدّ و معاون ثابت ہوگا۔

اس مسبب الاسباب اور علة العلل کا قدوس ہونا، سلام ہونا، کریم ہونا، حسیب اور مالك يوم الدين ہونا، غفور و تواب ہونا پھر ان صفات کمالیہ کے اتصاف کے لوازم مثلاً حمید و مجید ہونا، رشید ہونا نفسیاتی طور پر خود بندے کو جس کا کام اپنے آقا کے اسمار حسنیٰ سے متاثر ہونا اور آپ میں ان کو منعکس کرنے کی کوشش کرنا ہے کتنا بلند اور برتر بنا دیتے ہے۔

اگر قرآن مجید کی ان واضح تنبیہوں کو، عقل سلیم کے کھلے تقاضوں کو، فطرت انسانی کے مسلسل اور متواتر باطنی احساسات کو پھر انسان کی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی ارتقار میں اللہ کے برتر اور معیاری تصور کی افادیت کو نظر انداز کر دیا جائے اور عقل نظری کے بے سروپا احتمالات اور مابعد الطبیعیاتی کھوکھلے امکانات کو اہمیت دی جائے تو پھر باور کرنا پڑے گا کہ بے شعوری نے شعور کا روپ دھارن کیا ہے بے مقصدی نے مقصد کو جنم دیا ہے

بے نظمی نے نظم پیدا کیا ہے، حادثہ منصوبہ بندی ہوتا جا رہا ہے، سادگی پیچیدگی بنتی جا رہی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ بے کراں کائنات کے ان گنت مظاہر کے طبیعیاتی اور کیمیائی خصوصیات حادثہ ہیں بے سبب، اتفاقات ہیں بے علت۔ کیونکہ ان نامشاہد استنباطات اور غیر تجربی قیاسات کے پیچھے اگر مشاہدہ ہے تو صرف مادے کے تصور کا، اگر تجربہ ہے تو محض اس کی تبدیلیوں کا اور علم ہے تو بس اس کی خصوصیات کا، اس کے مقابلے میں اگر ازلی ابدی باشعور اقتدار اعلیٰ کا قیاس زیادہ غیر عقلی ہے تو پھر کسی بندر کو ٹائپ کی مشین پر انگلی مارتے دیکھ کر یہ باور کر لیتا کہ اس مشین پر ٹائپ کیا ہوا دغالب کا، قصیدہ اسی بندر کی انگلیوں کی اتفاقی تصنیف دکتابت ہے، زیادہ قرین قیاس ہے اس یقین سے کہ کوئی شخص اس قصیدہ کو ٹائپ کر کے مشین پر چھوڑ گیا ہے۔

بقیہ حسرت موہانی

یاد آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کنستر لیا اور کانگریس کے نقار خانے میں جا کر بجانا شروع کر دیا۔ چندے یہ حالت رہی کہ گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی بینڈ ماسٹری سے انحراف کا وہم و گمان بھی نہ گزرتا تھا۔ مگر آخر کار یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اپنی آوازوں میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اتنا معلوم ہوتا تھا کہ فیروز شا اور گوکھلے بھی دشمنان ملک نظر آنے لگے۔ پال اور تلک " نیتان آزادی کے شیروں " کی چنگھاڑنے دل اور دماغ پر کشش کی یہاں تک کہ گنگا جمنا سے گزر کر وادی نیل بھی حکومت برطانیہ کو برا کہہ اٹھی۔ تعزیرات ہند نے ان کو بھی وہیں پہنچا دیا جہاں نیتان آزادی کے شیر کو؟

کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس ذہین اور طباع۔ نیک دل اور وطن پرست شخص کی موجودہ مصیبت پر افسوس نہ کرتے ہوں۔ جب تک آزاد تھا پورے طور سے آزاد تھا۔ اب قید میں ہے مگر اس کا دل اور دماغ اور روح ویسی ہی آزاد ہے ڈھائی برس کی قید شدید سے ڈیڑھ برس کی قید سخت رہ گئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن خدا چاہے تو یہ مصیبت بھی اس پر آسان کر سکتا ہے۔

زمانہ دسمبر ۱۹۰۸ء

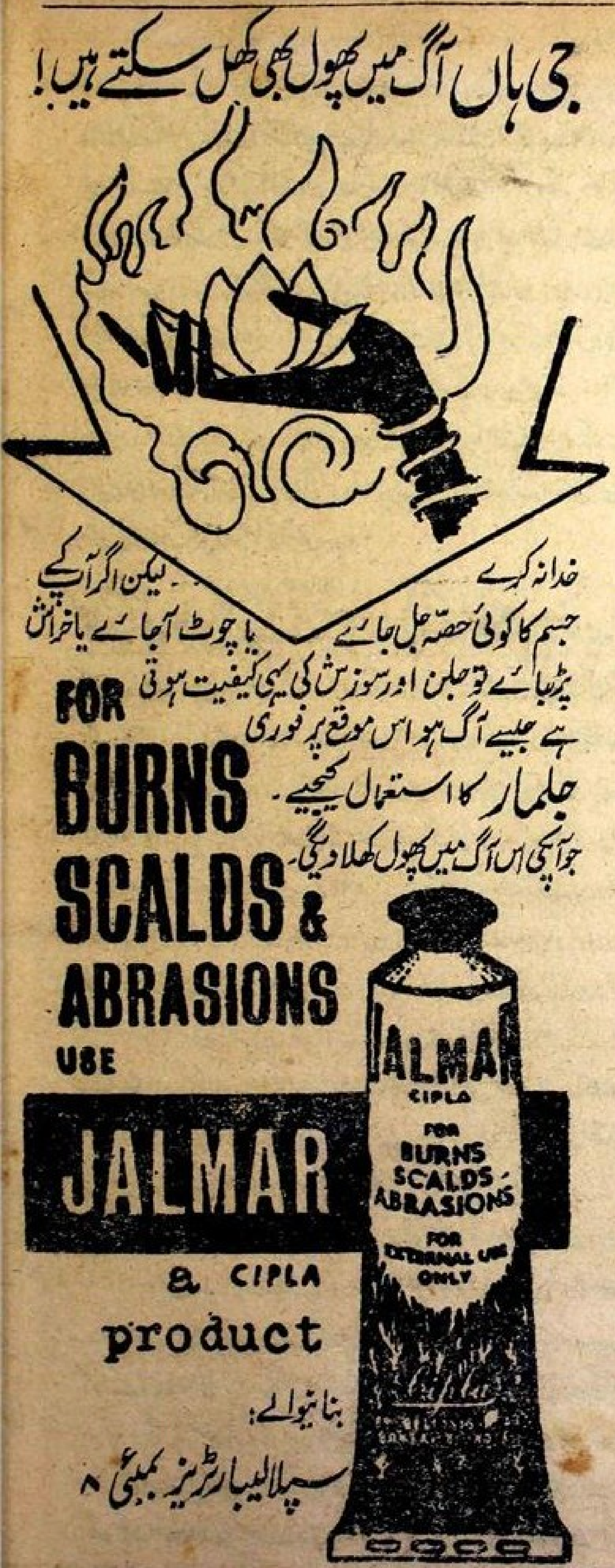

چھیڑ غالب سے چلی جائے

مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے مرزا غالب کا نام لوگوں تک پہنچانے میں اُن کی زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی بڑا سہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں۔ ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمو لیا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دل چسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

چند لکھنے والے:

ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ حمید احمد خاں۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ سید وقار عظیم۔ شوکت تھانوی۔ ڈاکٹر محمد اشرف۔ ہری چند اختر۔ حمیدہ سلطان۔ سراج احمد علوی۔ کنھیا لال کپور۔ فیاض عالم۔ حاجی لق لق۔ اور دوسرے۔ قیمت ۵ روپے

نگار بُک ایجنسی رامپور

بنامِ غالب

مرتبہ: اکبر علیخاں

اس مجموعے میں ایسے خطوط جمع کر دیے گئے ہیں جو غالب کے احباب و تلامذہ نے ان کے نام لکھے تھے۔ جہاں ان خطوط کے ذریعے پہلی بار بہت سے نئے مسائل اور اُن کا حل سامنے آئے گا وہیں خود مکتوبات غالب کے کتنے ہی تاریک گوشے روشنی میں آجائیں گے۔ غالب کے ماحول کو سمجھنے میں ان خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دیباچے اور حواشی کے سائے میں ان کا مطالعہ اور بھی دل چسپ سہل اور مفید تر ہو گیا ہے۔

زیر طبع

ناشر: ادارہ یادگار غالب پھلواڑ رامپور یو،پی

حسرت موہانی

ایک قدردان کی نظر سے

خافی خاں

انیسویں صدی کے آخری برس اور اس سے ایک سال پیشتر جو لوگ علیگڈھ میں تھے اُن کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نوواردوں میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل
وشباہت وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دلچسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے "خالہ اماں" نام دیا تھا۔
چھوٹا قد لاغر بدن۔ گندمی رنگ چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا خیال کرتے ہوئے ڈاڑھی کسی قدر نیچی فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ
قیافہ کو ناگوار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کے چارخانے کا انگرکھا۔ مشروع کا تنگ پاجامہ جس کے پائچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک
اور چھتری اضافہ کیجیے تو خالہ اماں، یا دوسرے لفظوں میں۔ فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور کے سامنے پھرنے لگے گی۔ عموماً تیز چلتے تھے
مگر جس طرح صاحب عصر جدید کے والد مرحوم آہستہ خرام تھے مگر ضرورت کے وقت تیز بھی چل سکتے تھے، اسی طرح فضل الحسن آہستہ بھی چل سکتے تھے اور نوع حیوانات
کی اس عام صفت سے محروم نہ تھے۔

علی گڑھ کالج میں اپنی ہستی کا منشا پورا کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ہمیشہ چند تیز فہم حقیقت شناس ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کسی
کیریکٹر کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو ایک لفظ یا ایک نام سے ظاہر کر سکتے ہیں اس طرح کہ یہ نام موت تک اس صید بے گناہ کے گلے کا پھندا
ہو جائے۔ بہت سے مشہور اور معزز لوگ ہیں کہ بدون 'بوم' یا 'خبیا' ان کے ناموں پر اضافہ کیے ہوئے ان کے عزیز ترین دوست بھی صاحب نام کو پہچان نہیں
سکتے غرض اس قسم کے ناموں میں کہ جن کی نسبت الاسمائے منزل من السماء، صادق آتا ہے ایک نام خالہ اماں بھی تھا۔ ہمارے دوست کی ہیئت ظاہر
تو اس نام کی مستحق تھی ہی مگر جس چیز نے اس نام کو برخلاف دوسرے ناموں کے محض ظرافت و مذاق ہی کا ذریعہ نہیں بنا دیا تھا بلکہ اس سے ایک سلیقہ
اور بے تکلفی کا اظہار بھی متصور ہوتا تھا، وہ فضل، کی مرنجان مرنج طبیعت۔ خندہ روی۔ عالم دوستی اور حسن پرستی تھی۔

ان اوصاف کے ساتھ ہی فضلل ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ ایسا کہ پرانی وضع کے مسلمان اس کے کسی قول و فعل پر گرفت نہ کر سکتے تھے۔ صوم
کی پابندی اس کی زندگی کا جزو ضروری تھا مگر برخلاف عوام کے اس سے اس کی شیرینیٔ طبع میں فتور نہیں آنے پایا یہ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم
ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آ پہنچا، فضلل مسکراتے ہوئے اُٹھے۔ معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ
ہو کر پھر آ بیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد جلد پڑھتے تھے، بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب
ابجد پڑھ لیا کرتے تھے۔ بزرگانِ دین کے مزاروں کی ان کو ایسی ہی جستجو رہتی تھی جیسی از یادرفتہ اساتذۂ قدیم کے دیوانوں کی۔ دہلی اور آگرہ میں کم مزار ایسے
ہوں گے جن کی جالیوں میں فضلل نے چھلے نہ باندھے ہوں۔

غرض ان اوصاف کا نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ خالہ اماں نے عدم کی راہ لی اور اس کے بجائے "مولا
بچے سے لے کر بوڑھے تک کی زبان پر جاری ہو گیا۔ کالج کی تاریخ القاب بخشی میں یہ ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں۔

مگر یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ فضلل کے لیے حصول عزت و محبت کا باعث ہو سکتے تھے، مگر حصول شہرت؟ اس کے لئے فطرت نے
کو بہت کچھ عطا ہوا تھا۔ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین

انگریزی میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ کسی صحیفۂ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا یا لکھنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واقعہ ہے، گو اس کا سننا نفاست پسند طبیعتوں کو ناگوار گذرے کہ اس موذی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے صحت خانے سے باہر کبھی برضا و رغبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی وہ امتحان میں ناکام نہیں رہے۔

غرض اردو فارسی اور خاص کر ادب اردو سے اس شخص کو عشق تھا۔ جس زمانے میں عام طالب علم دارالاقامت اور بیت الطعام کے مناصب بالتری کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں رہتے ہیں اُس زمانے میں تضلل اساتذۂ قدیم کے دیوان جمع کرتے اور اُن کی خشک ہڈیوں پر "قم باذنی" پڑھنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ کئی مشہور اور بہت سے بھولے ہوئے شعرائے اردو کے کلام کا اتنا بڑا مجموعہ اس قدامت پرست نے جمع کر لیا کہ شاید پُرانے کتب خانوں کے سوا کہیں نہ ہو۔

اسی زمانے میں سید سجاد حیدر کی جدت پسند طبیعت نے انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی نفسانی زندگی میں فقط یہ ایک مجلس تھی جس میں علم دوست طبیعتیں عام ہوا و ہوس کی تخریب اوقات کشاکش سے پناہ لیتی تھیں ہفتے میں ایک مرتبہ۔ شاید اتوار کی شب کو۔ ایک مقام مقررہ فرش و فروش سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اراکین مجلس اور دوسرے مشتاقان سخن خوش وضع انگرکھے۔ اچکنیں اور شیروانیاں۔ دو پلی ٹوپیاں سروں پر دیئے ہوئے قرینے سے بیٹھ جاتے۔ شمع ایک ایک کے سامنے آتی اور وہ نظم و نثر تازہ کے پھول نذر کرتا۔ داد تحسین اور آداب و تسلیمات کا انداز فنونِ لطیفہ کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ایسی انجمن کی ترقی کے لئے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اردوئے معلیٰ اور مولانا ایسے لازم ملزوم ہو گئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین مناظرے کی رُوح و رواں خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ متروک الفاظ پر ایک سلسلۂ مضامین جو عرصہ تک مخزن میں چھپا کیا اپنی جدت اور انداز تحریر کی دلنشینی کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا۔

انھیں ایام میں چودھری خوشی محمد نے علیگڈھ منتھلی میں قدیم اردو شاعری پر ایک قبیح حملہ کیا اس مضمون کا اندازِ تحریر اور پیرایہ استدلال اس قسم کا تھا کہ حسرت سے جس کا دل اور دماغ میر و سودا اور مصحفی اور انشا کے کلام سے سرشار تھا۔ ضبط نہ ہو سکا۔ چنانچہ۔

اس رنگ سے اٹھائی کچھ اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

اردو شاعری کی خوبیوں کی داد دینے کے بعد حریف کے ڈرامے کے جواب میں تصوف کو پیش کیا اور نئی شاعری جس کو چودھری صاحب نیچرل شاعری بتاتے تھے اس کی اور مولانا حالی کی جھوٹی تقلید کی ایسی خبر لی کہ جنگ ادبی کا پورا لطف آ گیا۔

جب حسرت کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کو آیا تو سید سجاد حیدر بیلدار لاج یعنی دکنوار (اکثرم) میں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ گویا اردوئے معلیٰ کے چراغ حیات کے لئے سحر قریب تھی مگر قفنس کی طرح اردوئے معلیٰ نے بھی مرتے مرتے ایک ایسی راگنی گائی جس کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک عالیشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی۔ تمام ہندوستان کے شعرائے اردو کی خدمت میں شرکت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ اکثر اساتذہ عالی قدر نے دعوت قبول فرمائی اور اسٹریچی ہال میں جو ایک ربع صدی سے نثر سنتے سنتے تھک گیا تھا ایسا شاندار مشاعرہ ہوا کہ اب تک اس کی یاد دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔ سپہر نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی حضرات مجروح و تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے ستاروں نے اپنا کمال دکھایا مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب۔ یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر بھی ہو گئے۔

اگلی صبح خاتمہ سبق پر تھیوڈر ماریسن تھے اور فضلل کا دامن۔ عقاب جیسے کسی کمزور چڑیا کو پکڑ کر آن واحد میں آسمان کی بلندی میں جا چھپتا ہے، اسی طرح ماریسن صاحب چہرے پر غصے کی (جو صاف بناوٹ معلوم ہوتا تھا) کیفیت پیدا کیے ہوئے غریب فضل الحسن کو پکڑے ہوئے دوال دوال دفتر کی طرف لے گئے یاں سب لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھا کیے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

اتنے میں شیر غرّایا "تو کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"

سہمی ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب ملا "جی ہاں۔ ہم لوگوں کا معیار آپ سے نرخ مختلف ہے"!

مسٹر مارسین جھنجھلا کر بولے یہ سراسر بکواس ہے۔ کئی پرانے طالب علم خلاف تہذیب اشعار پڑھے جانے کی مجھ سے ابھی شکایت کر چکے ہیں۔

تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اردوئے معلی نے بار دگر ترک وطن کیا۔ مولانا کو اب تک یقین ہے کہ پرانے طالب علموں سے مارسین صاحب کی مراد "نیچرل شاعر" تھے۔

مگر اس علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کے عادات میں ایک ایسا وصف نشو ونما پا رہا تھا کہ جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں نظر آیا۔ اور جس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ شخص کہ جو مذہب اور ادب میں ایسا قدامت پرست تھا پالٹکس میں کانگریس کے مقدمۃ الجیش میں کیونکر شریک ہوگیا یہ وصف وہ تھا جسے انگریزی محاورے کے مطابق 'صدائے بلند ترین کا ہم آہنگ ہوجانا' کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ وصف فتنۂ اثر ظاہر ہوا اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ شملے میں علیگڑھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کالج کے بنی اسرائیل اس پر آپے سے باہر ہوگئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلات موسیقی جو کالج میں دستیاب ہوسکتے تھے یعنی تھالیاں، لوٹے۔ گلاس۔ کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شور محشر برپا کرتا تھا۔ فضل الحسن جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھوا تھا نہ گیند پھینکا تھا۔ یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالہ خاک کرکے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے ان کا نام لکھ لیا گیا۔

برسات کا پہلا پانی جیسا معنی خیز ہے وہ کچھ علی گڑھ ہی کے لڑکے خوب جانتے ہیں۔ اس روز پاس عقل عین حماقت ہے۔ مگر جماعت سے باہر ایک دن حسب دستور قدیم جا بجا لڑکے ہولی کھیل رہے تھے۔ پکڑو پکڑو جانے نہ پائیں، نکالو۔ نکالو۔ دروازے توڑ کر نکالو۔ پھر کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گھڑوں کے پھوٹنے، پھسل پھسل کر دھم سے گرنے کی آوازوں قہقہوں کے شور وغل سے آسمان پر بجلی اور زمین پر مینڈکوں کے زہرے پانی ہوئے جاتے تھے۔ مگر ہنوز بعض جماعتیں کالج ہی میں تھیں۔ مولانا میں تاب ضبط کہاں۔ دونوں ہاتھوں میں کیچڑ کے لوندے لیے ہوئے وہیں پہنچے اور اگر عربی کے پروفیسر بلطائف الحیل نہ ٹال دیتے تو عبا اور عمامے پر بھی دو چار چھینٹے پڑ ہی جاتے۔ فرد سیاہ گھات میں لگی ہی تھی نکلی اور مولانا کا نام درج ہوگیا۔

جون کی دوپہر تھی۔ اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ مولانا شاید ستہ استراحت پر تھے کہ ظہور وارڈ[1] کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا۔ گھبرا کر ننگے پاؤں ننگے سر کمرے سے نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ اسکول کے کسی لڑکے کو ایک مالی نے آم چرانے کے شبہ میں مارا ہے اور کچھ لڑکے اس شقی کی تنبیہ کو نکلے ہیں۔ مولانا اس ہیئت سے "پکڑو بدمعاش کو۔ مارو بدمعاش کو۔" کا شور کرتے ہوئے اس یورش میں شریک ہوگئے۔ مالی تو خیر پایا نہ پٹا مگر ادھر اس مہم کا واپس آنا تھا کہ ادھر اُس عیار زماں نے بیسوں درخت لنگڑے اور بمبئی کے تاراج کر دیے اور کئی سو روپے کا بطور تلافی نقصان کالج سے طالب ہوا۔ اس یلغار کا سپہ سالار بے چارے مولانا کو قرار دیا محض اس لئے کہ ان کا پہچاننا اوروں کی نسبت آسان تر تھا۔ فرد سیاہ ایک مرتبہ پھر نکلی اور مولانا کچھ عرصے کے لئے حکماً کالج سے رخصت کر دیئے گئے۔ سرآمد ضلع گویان جناب میر عباس حسین صاحب پروفیسر نے کہ مہتمم باغات بھی تھے باغ لوٹنے پر فضل الحسن کو باغی قصہ دیا اور فرمایا کہ "میاں مالی کی بد اعمالی پر اس کی گوشمالی بیشک ضروری تھی مگر مالی نقصان تو بیچارہ برداشت نہیں کرسکتا"۔

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اردو تقریر کا ملکہ مولانا میں بہت اچھا تھا۔ یونین کلب کے بے اصول جتھے ان کی نگاہ میں بے وقعت تھے اور آزادہ روی مسلک تھا۔ ایک مرتبہ انتخاب کے موقع پر بطور امیدوار آزاد، کوشاں ہوئے مگر کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسری مرتبہ دونوں فریق ان سے طالب استمداد ہوئے اور وہ صدائے بلند ترین کے اصول پر کاربند ہوکر ایک فریق کی شرکت سے سکریٹری منتخب ہوگئے۔ مگر یہ جوڑ نبھ نہ سکا جس فریق سے مولانا نے شرکت کی تھی اُس کے اور مولانا

---

[1] بورڈنگ ہاؤس کا نام ہے۔ (اب اس عمارت میں ادارۂ علوم اسلامیہ ہے۔ نگار)

کے خیالات اور عادات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شکر رنجی پیدا ہوائی۔ اس سے نفاق اور نفاق سے منافرت۔ اسی حالت میں سکریٹری صاحب سے ایک نامبارک غلطی سرزد ہو گئی۔ حریف تو تاک میں لگے ہی تھے، مجلس معتمدہ کا پورا اجلاس جس میں مسٹر تھیوڈر ماریسن مسٹر ٹینگ اور مسٹر براون وغیرہ شریک تھے منعقد کرا کر مولانا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

غرضکہ یہ وصعت جسے ایک قسم کی فطری کمزوری کہنا چاہیئے گاہے بگاہے مولانا کے زمانہ تعلیم میں ظاہر ہوا کیا۔ زمانہ تعلیم ختم ہوا تو وظیفہ قانونی کے لئے مولانا نے درخواست کی۔ مسٹر ماریسن نے نہ دیا۔ بورڈنگ ہوس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت نہیں ملی۔

مایوسی اور افسردگی کا اس کے سوا کیا علاج تھا کہ شہر میں سکونت اختیار کر کے برسوں کی آرزو یعنی زبان اردو کی خدمت میں زندگی وقف کر دی جائے اور برائے نام قانون کے سبقوں میں بھی حاضر ہو جایا کریں۔

رسالہ اردوئے معلیٰ جاری ہوا اور آب و تاب سے جاری ہوا۔ وہیلائے ادب نے حیرت اور استعجاب سے دیکھا کہ ایک کم عمر نوجوان نے جو ابھی کل کتب سے نکلا تھا صحائف اُردو کے لئے کیسے نئے نئے راستے کھول دیئے ہیں۔ اپنے ذاتی رسالے کے ذریعہ سے جدید شاعری اور اس کے قدردانوں کو لے ڈالنا کون مشکل تھا۔ اکثر لحاظ سے پنجاب اس مفروضہ نیچرل شاعری کا مرکز تھا۔ مولانا حالی مدظلہ العالی کا وطن ایک حیثیت سے پنجاب ہی تھا۔ چودھری خوشی محمد ناظر کے پہاڑوں سے قدیم شاعری پر پتھر برسایا کرتے تھے، چٹائی، جھاڑو، ٹوپی اور لنگوٹی پر وہیں کے اخباروں میں طبع آزمائیاں ہوتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نیا ستارہ "اقبال" کی صورت میں طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں تسخیر کا عمل تھا۔ علیگڈھ منتھلی میں ایک مضمون اردو زبان پنجاب میں کا چھپنا مولانا کے لئے بہانہ ہو گیا۔ مہینوں تک کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا جس میں فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح حسرت اور ان کے تابعین کی سردھڑی اور کٹار مولانا حالی اور اقبال پر نہ چلاکی۔ ان شیران میدان سخن پر تو خیر یہ کیا اثر کر سکتی تھی تاہم چھوٹے مقلدوں کے سراسیمہ اور حواس باختہ کرنے کو یہی کافی بلکہ اس سے بڑھ کر تھے مگر میرا مقصد اس بیان سے کیریکٹر کے غلبے کی ایک خوبصورت مثال پیش کرنا ہے

کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت دو دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلیٰ کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور اردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور "واہ۔ خوب لکھا" کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں۔ ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، "ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے" اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہنا شروع کیے "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روک لیں اتنا اچھا ہے"۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ "نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں"۔

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے"

مگر ابھی "ہم آہنگی صدائے ترین" کے لئے ایک ایسا وسیع میدان باقی تھا جس کے لیے حسرت کے پاس 'دل'، اور زبان کے سوا کوئی قابلیت نہ تھی۔ یہ میدان میدان پالٹکس تھا۔

حسرت نے نگاہ غور سے دیکھا تو ایک طرف ۷ کروڑ مسلمانوں کو آیہ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول والی الامر منکم" کے اثر سے صُمٌّ بُکمٌ پایا۔ وفاداری کا گوسالہ جو علیگڈھ کے سامری کے ہاتھوں نے تیار کیا تھا ان کی توجہ کو کسی دوسری طرف ہٹنے بھی نہ دیا۔ ادھر ۲۱ کروڑ ہندؤں کو دیکھا کہ بحر مواج کی تلاطم میں ہیں اور کانگریس کے شور کے سامنے صور اسرافیل کا شور طوطی کی صدا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی محافظین فردسیاہ کا سلوک

غلام ربّانی تاباں:

اُس دشمنِ تمکیں کا اشارا ابھی بہت ہے — خرمن کے لئے ایک شرارا ابھی بہت ہے
ہر موجِ ہوس سر سے گزر جائے ہے ورنہ — جینے کو غمِ دل کا سہارا ابھی بہت ہے
پھولوں سے تہی شوق کا دامن ہے تو کیا غم — ہم اہلِ تمنا کو نظارا ابھی بہت ہے
آجاتے ہے رہ رہ کے خیالِ مہ و خورشید — ہر چند شبِ غم کوئی تارا ابھی بہت ہے
لائی ہے تری یاد بہت دل پہ خرابی — گو دل کو خرابی نے سنوارا ابھی بہت ہے
ڈرتا ہوں نہ حرف آئے ترے ذوقِ جفا پر — ہونے کو تو یہ درد گوارا ابھی بہت ہے

ہم آبلہ پایانِ رہِ شوق کو تاباں
یہ دوریِ منزل کا سہارا ابھی بہت ہے

وقار خلیل:

یہ شب و روز یہ نشیب و فراز — زندگی ہے کہ دُور کی آواز
دیکھنا! ہر فریبِ خندۂ گل — کتنی محرومیوں کا ہے غماز
ایک مدت سے کن اندھیروں میں — زندگانی ہے گوش بر آواز
وقت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں — آج بھی وقت کے نشیب و فراز
تیری راہوں میں اے غمِ دوراں — ہو چلا ہے یقینِ عمرِ دراز
ہم نے سمجھا خوشی جہاں غم نے — اپنا لہجہ بدل کے دی آواز

شعر ہیں اصل میں وقار خلیل
اپنے وجدان کا سبک انداز

بُت شکنی

(چینی جارحیت سے متاثر ہو کر)

کیفی اعظمی

پوجا تھا تمہیں بت کی طرح ہم نے کسی دن — گو جاں پہ عقیدت میں کئی بار بنی بھی
ماتھے سے کئی بار لہو سجدے میں ٹپکا — آنکھوں سے مئے درد کئی بار چھنی بھی
تم سازِ وفا کو کبھی خاطر میں نہ لائے — گردن تھی جھکانا جسے اکڑی بھی تنی بھی
گھبرا گئی سازش بھی اگر تم رہے خاموش — کی بات تو شرما گئی ناوک فگنی بھی
اک بات سمجھ لو گے تو کھل جائیں گی آنکھیں — پوجا ہے تو آتی ہے ہمیں بت شکنی بھی

جاں دی ہے سدا دیں گے سدا اپنے وطن پر
گو آج بہت سستی ہے حب الوطنی بھی

غالبیہ

یعنی

غالب نام آور انیسویں
صدی کے آئینے میں

ترتیب و تحشیہ

اکبر علی خاں

اسسٹنٹ لائبریرین
رامپور رضا لائبریری

تعارف

غالب ہمارا محبوب موضوع ہے۔ اس پر تنقیدی اور تحقیقی دونوں انداز سے بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ہماری دلچسپی اس موضوع کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے نئے نئے گوشے بھی سامنے آتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی غالب کے بارے میں بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اس معنی میں اردو کی سب سے زیادہ خوش نصیب شخصیت ہے کہ اُس سے متعلق جتنی بھی تفصیلی معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کسی بھی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں۔ اُس کے معاصرین میں سے ذوق اور مومن ہی کو لیجیے ہم ان دونوں کے بارے میں مقابلتہً کتنا کم جانتے ہیں حد یہ ہے کہ غالب کے معاصرین میں سے کسی کی بھی عکسی تصویر نہیں ملتی بہرحال غالب ایک استثنا ہے۔

اب کہ غالب اتنا محبوب ہو چکا ہے اور اُس پر بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اُسے اُس کے عہد کے آئینے میں بھی دیکھیں اور یہ جانیں کہ اُس کے معاصرین اُسے باعتبار ایک انسان اور باعتبار ایک فنکار کے کیسا جانتے تھے۔ یقیناً یہ مطالعہ ہماری معلومات میں دلچسپ اضافہ کرے گا اور اس کے نتائج ہمارے سامنے غالب کو سمجھنے کی بہت سی راہیں کھول دیں گے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے ایسی سب تحریریں جمع کر دی ہیں جو انیسویں صدی کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس صدی میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا برتا تھا یا اس کے بارے میں معتبر روایات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ایسی ایک ایک سطر جو غالب کو اس کے عہد میں جاننے کے لیے ضروری ہے ایک رشتے میں منسلک کر دوں چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تحریروں میں غالب کے متعلق جو بیش قیمت مواد ہے وہ یکجا کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔ مطالعہ میں سہولت پیدا کرنے کے خیال سے میں نے اس کام کو چند ابواب پر تقسیم کر دیا ہے۔

ان عبارتوں پر ضروری اور مفید حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جن کے ذریعہ ہر تحریر اور صاحب تحریر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ماخذ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ سارا کام بالاقساط قارئین نگار کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اصل عبارتیں اور اس کے بعد حواشی۔

اس بار پہلا باب جس میں تذکروں کے اقتباسات ہیں۔ شایع کیا جا رہا ہے۔ عیار الشعرا اور عمدۂ منتخبہ کے علاوہ تمام تذکروں سے انتخاب اشعار کا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ استثنا اس لیے ضروری تھا کہ ان دونوں میں غالب کے کچھ قلمزد اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کی بالکل ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس تفریق کو روا رکھا جائے۔

یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ آب حیات کی عبارت کو صرف نگار کے صفحات کی حد تک اس کی طوالت اور کتاب کے سہل الحصول ہونے کے باعث ترک کر دیا گیا ہے۔ اور چند ابتدائی سطور ہی نقل کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا نام **غالبیہ** رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر نام جو اس کتاب کی بہتر نمائندگی کرتا ہے پسند کیا جائے گا۔ جلد ہی برصغیر کا ایک نامور دار الاشاعت اسے خوبصورت ٹائپ میں بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے لیکن میرا جی نہیں مانا کہ نگار دوستوں کو یہ تحفہ دیر سے پہنچے اس لیے ان اوراق پر یہ مکمل کتاب کم سے کم قسطوں میں منتقل کر دی جائے گی۔

توقع ہے کہ اس سلسلے میں غالب پسندوں کی جانب سے مجھے مفید مشورے بھی ملیں گے تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ مکمل شکل دی جا سکے۔

اکبر علی خاں

ار الشعرا —— خوب چند ذکا

مرزا اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، المتخلص بہ غالب، ولد مرزا عبد اللہ خان، عرف مرزا دولہ، نبیرۂ مرزا غلام حسین خان کمیدان، ن بلدۂ اکبر آباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعر فارسی و ہندی است۔ از وست:

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا — کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی — سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز
باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے — چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی — کہ رُدے غنچۂ گل سوے آشیاں پھر جائے
زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے — ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ — متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

ص ۵۴۱ — ۵۴۲

دۂ منتخبہ —— نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور

اسد تخلص، اسد اللہ خان، عرف میرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافۂ اکبر آباد۔ جوان قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ بہ خوش خلقی ر تمدہ۔ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن [بمودہ] غم ہای عشق مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز۔ در فن سخن سنجی متتبع محاورات میرزا عبد القادر ل علیہ الرحمۃ در ریختہ در محاورات فارسی موزون می کند۔ بالجملہ موحد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ ضامین نازک موزوں گشتہ۔ نادرۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد از نتائج طبع اوست:

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو — وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو تازہ
دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو تازہ
آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک — لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک
آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں — ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں
ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے — یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے تازہ
دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے — دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے تازہ
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش — اب شکست توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے تازہ
مجلس شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں — شمع ساں میں تہ داماں صبا جاتا ہوں تازہ
ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں تازہ

سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرای ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویای زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہ ہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سُنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
بے خودی بے سبب نہیں غالب
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش

بے قراری کا حکم جاری ہے ہے
آج پھر اُس کی روبکاری ہے
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

(ورق ۴۶ الف — ۴۸ الف)

گلشن بیخار — نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان، المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندان فخیم است و از روسای قدیم. سابقاً مستقر الخلافت اکبرآباد از استقرارش سرگرم کبر ونازبود اکنون دارالخلافہ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزای صفاہان و شیراز. طوطی بلند پرواز چمن معانی است وبلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی. پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب تہ نشینی غورش، سرفرازی قارون، کرسی نشین شاہین فکرش. جز بشکار عنقا نہ پردازد و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد. اگرام و ز بتلاش متاع نفیس شتابی، جز بدکانش درنیابی. سالہاست کہ پا بدائرۂ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضای طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن میگفت و وقت آفرینیہا میکرد آخرالامر از آں طریقہ اعراض کردہ اندازی مطبوع ابداع نمودہ، دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب و گر نگریست فراوان ابیات از آن حذف وساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ. مدتہاست کہ بنظم ریختہ سری ندارد. در زبان فارسی نیز دستگاہ بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ. پایہ اش از فحول استادان کم نیست. غزلش چوں غزل نظیری بی نظیر و قصیدہ اش چو قصیدۂ عرفی دلپذیر. مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پی می برد، و این فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است. اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ میرسی. چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر. خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ و حظی ربودہ. بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ. دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد، اما پیوند معنی مستحکم است دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات از آن منتخب گردید.

(ص ۱۸۵ — ۱۸۷)

گلدستۂ نازنیناں — منشی کریم الدین

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معرف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور روسای قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں. ادیب لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی اُن کی کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور، سخن فہم و سخن داں اس پایے پر کہ متنبی و کعب باوجود تنبا اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے اُن کے حضور. اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری. مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری. خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا، خاقانی بجا رعب کشی مستعد لبسر دیا. فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اُس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا. صاحب دیوان و تصانیف ہیں، مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصنیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا. اُسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے. مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے اس لئے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے.

ص ۲۱۵ — ۲۱۶

طبقات الشعرا ——— منشی کریم الدین

غالب تخلص، اسد اللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور روسای قدیم سے ہے۔ ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہجہان آباد میں ۱۲۵۰ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے بہت بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۰ھ کے چھپا تھا۔ حال اس کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان در تین جز کا بنا لیا۔ وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے۔ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن اس مقولہ کا موید صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے بڑا اُبرا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اُن کی اس سال قریب ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ اشعار اُس کے ہیں۔

ص ۳۹۵ - ۳۹۶

……. جس سال کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسین صاحب جو کہ عالم کامل اور قدر شناس اہل علم کے ہیں، شاہ جہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا سب طلبہ کے امتحان لیکر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔ شاہ جہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں: ایک مرزا نوشہ صاحب دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا، حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی، مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری اُنکے واسطے مقرر ہوا۔ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں درس و تدریس کرنے لگے ان کے روزگار کے باب میں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی، کیونکہ وہ شخص اس عہدہ کے قابل تھا۔ بعد ایک عرصہ کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی، ہنوز وہی تنخواہ پاتے ہیں۔ شاہ جہاں آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔…

ص ۴۳۸ — ۴۳۹

"……. غالب، مرزا نوشہ غالب اردو شعر بھی جو کہتے ہیں موتی پروتے ہیں۔ جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو میں بھی جلیل القدر استاد ہے۔"

ص ۵۴۱

آثار الصنادید ——— سر سیّد احمد خاں

ہمای اوج مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہی مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنای الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری و والا تباری، مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری، شاگرد رحمٰن، استاد سحبان، المعی زمان، لوذعی بیان، فرزدق دہر و لبید اوان، سمی وصی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ، غالب تخلص دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری انھیں کے شعلۂ فکر سے

روشن اور سفینۂ ادراک اعلیٰ کی اس حضرت سے مشحون۔ عنصری ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبانی ان کی حسرت کمال سے ایسا رویا کہ مگر اُس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحٰق اطعمہ ان کے خوانِ استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس خسروِ معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت۔ ملاحت کلام سعدی ان کے خوانِ فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار۔ رنگینی معنی سے صفحے کو گلرنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو رشک ارژنگ کرنا، خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ، اکاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورقِ بیاض، صدرہ مرصر سے جگہ سے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی ستاوش سے فوارہ نور اور عبارتِ پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شرابِ انگور۔ اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو ظرفِ حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ دوزباں بیان کرے، اوّل چاہیے کہ فکر، عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفترِ کتاب میں مندرج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدیس جوہر اور امداد مبدا رفیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنانِ بارگاہِ ازل سے کمیٔ استعداد کا طعنہ سُنا اور سُوئے ادب کی سرزنش حاصل کی، تو بایں ہمہ نقصانِ عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر لنگ لنگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیتا تو بوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوتی۔ اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طینت کے آگے حصولِ صلۂ آفرین تو کیا خجلتِ نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے:

”کسی کہ از عہدہ ثنای کسی بیرون نیاید جیا اول بعجز اعتراف نہ نماید“

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔ بیت:

بامی است بعید بلند و پستی ہان پای نہ لغزدت ز مستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے ہم جنس ہم گوہر تھے فرماں روائی کرتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جدِ امجد اپنے پدرِ مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق رہے۔ اور اُس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشوونما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبرآباد اختیار کی۔ اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنارِ شفقت اور آغوشِ عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناتِ نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے۔ آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصراللہ بیگ خاں، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادپیما کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کارِ نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافاتِ اکبرآباد سے اُن کی حین حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا وہ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بسبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر مد حرف، زبانِ سپاس ہے، ان کی نعمت تربیت کا۔ راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ ”ولہارا بدلہا راہ باشد“ ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں اِن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور اِن کے ایک گل کو

بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپکی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں، اور جواہر گراں مایہ کو آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر یہی جزدان حافظہ میں محفوظ اور یہی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی ہر مستفید کے پاس خردار خروار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبدا رفیاض کے آپ کی طبیعت موہبت نسبت بخل سے متبرا ہے آپ کو اُن جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں آرے۔

نطقش کہ بدست جان توانا
چون بادہ خرد فزای دانا

آپ کا جواہر خانۂ نفائس سخن حد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیرون ہے۔ ایک دیوان قصاید و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر۔ اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فواید جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتایج فکر سے ہے کہ منتہیان معنی رس کیواسطے مغتنمات عظمیٰ سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی۔ راقم تیمناً و تبرکاً کچھ نظم اور کچھ نثر اس کتاب میں لکھ کر ہدیۂ نظر ارباب شوق کرتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ نظم کس رتبہ کا ہے اور نثر کس نشان کے ساتھ:

ص ۱۳۵ — ۱۳۹

گلستان بے خزاں ——— قطب الدین باطن

غالب وا سد تخلص، اسد اللہ خاں نام، ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں، کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبائر غلام حسین خاں کمیدان، قبل اس سے حد دہلی میں ان کی سکونت کا مکان۔ اوستادان باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور بادی شعراء جو بے نظیر روزگار رکھتے جن سے تعلیم پائی۔ ایام صبا سے ببرکت انفاس متبرکہ ان استادوں کے مرتبۂ علم پہنچے تب اُن کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں، جن کے ایسے استاد ہوں۔ متانت فحوائے کلام میں لاکلام، کلام سے بنیاد سخن کو استحکام، چونکہ وہ استاد مرگئے یہ حد دہلی سے ادھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔ ہاں خود استاد ہیں، مرغان مضامین کے صیاد ہیں۔ ہاں اُن کا فراخ حوصلہ ہے پھر تبختر کا کیا گلہ ہے۔ گو فارسی میں متین ہیں پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چین ہیں۔ اب بعد وفات ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو، کلام ان کا سحر حلال ہو مگر زمانہ خالی نہیں، کیا اور کسی کی طبیعت عالی نہیں۔ غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمان محکمۂ شعر کے روبرو معاملہ ہو۔ بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی، اور از حد اتحاد کی بات تھی۔ انتخاب زبان میں یکتۂ دوران ہیں جس طرف طبیعت آئی اسی کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دختر رز سے جو ناک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شراب شفق، قاضی آفتاب باد بپیشکش لایا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے، ایسا کمال پایا۔ شعر کم قدر اُن کا کبھی کسی کی زبان سے نہ سنا، نہ اپنی آنکھ سے دیکھا۔ لفاظی اور جودت زبان فیض ترجمان سے عیاں ہے۔ کلام شیریں وصف سرچشم فرہاد میں جس نے سنا حلاوت سخن اور گلوگیری سرمہ سے یارائے صفت شعر نہ ہا گویا کہ دقت امتحاں ہے۔ کثرت عذوبت سے ہونٹ چپک گئے سرمے کی خاصیت سے زبان سیہ گولال ہوئی، عدو تھک گئے۔ جو شخص اُن کے کلام سے بہرہ ور ہوا بیساختہ آفریں اور سبحان اللہ اُس کی زبان پر ہوا چونکہ یارائے کام و دہاں نہیں کہ منزل وصف میں قدم بڑھائے لہذا راقم توسن سبک تگ کلک سوئے بادیہ مطلب پر کرے۔ اب یہ دہلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں، غرور کی راہ چاہیں سو فرمائیں پر دل میں تو ان کا لوہا مانتے ہیں۔ دہلی والے صاحب کسی کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے، مارے خودی و تبختر کے جی میں پھولے نہیں سماتے۔ پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو۔

اِن کو شراب و کباب چاہیئے، خلاف شرع کا بے حساب چاہیئے روزے کے نام سے انھیں کیا کام نماز کو ان کا ہر دم سلام۔ اصحاب کرام کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی کیا غرور ہیں، اپنے نزدیک کتنے دور ہیں۔ یاران ہم صحبت اُن سے زیادہ غرور میں چور ہیں، گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ہیں۔ دہلی والے صاحبوں کے تذکرے جو عبارت رکھتے ہیں متاع حیرت شعرائے ماضی و حال و مصنف کو غارت

رکھتے ہیں۔ ہیں! ہیں! باطن کدھر گیا جوش میں بھر گیا، خبردار ہاہوشیار! ان کے اسدِ فکر کا نخچیر معنون پر غلبہ ہے، خمسہ ان کا شیر کا بچہ ہے۔ دیوان فارسی ضخیم ہے مگر اردو کا دیوان مانند آمدنامہ قلیل و قدیم ہے۔ اسدِ فکر، نیستان کاغذ میں ڈکارتا ہے رُوباہ مضامین کو ناحق جان سے مارتا ہے۔

ص ۱۷۱۔۱۷۳

سراپا سخن ——— میر محسن علی محسن

مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب، ولدِ عبداللہ بیگ خاں، قوم ترک، اولاد میں گستاسب کی، مولد اکبر آباد، مسکن دہلی۔ دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی ہیں۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فدا حسین فدائی قصبہ دیبائی سے بھیجی تھی۔ (ص ۴۴، ۳)

یادگار شعرا ——— اشپرنگر

اسد۔ اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ۔ انکے بزرگ سمرقند کے تھے اور یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے (تذکرہ سرور) ان کا تذکرہ غالب کے تخلص کے ذیل میں کیا جاوے گا۔ اور وقت سنہ ۱۸۵۲ میں یہ تقریباً ۶۰ سال کے ہیں۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس وقت یہ صرف فارسی میں اشعار لکھتے ہیں۔ انھوں نے انشا فارسی اور حضرت علی کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے (ص ۲۲)

غالب، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ بڑے عالی خاندان ہیں۔ پہلے آگرہ میں رہتے تھے۔ اب دہلی میں ہیں۔ یہ ایک پرانے شاعر ہیں۔ پہلے بیدل کا تتبع کرتے تھے، لیکن اب ایک طرز پیدا کیا ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔ (گلشن بے خار) ص ۱۴۵

گلشن ہمیشہ بہار ——— مولوی عبد العلیم محمد نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی

غالب تخلص، مرزا نوشہ کہ نام سامیش اسد اللہ خان است، نازپرور دار الخلافہ شاہجہان آباد نکتہ سنجی مزاج او ست وموزونیت کلام از جوہر طبع وہاج او۔ شاعری است کہ مانندش درین عہد زمان معدوم و عالی طبعی است کہ ندش تا قطع دور دوران غیر معلوم۔ نظیری در تغزل پیش او بعلو نظرش از شعرای عامی است و عرفی در تشبیب بعرفان مضامین عالیہ و جیند الکلامی غیر نامی در فکر سخن نام بر آوردہ و در میدان عرصہ گوی سبقت از ہمسران بردہ صاحب دیوان منیف است و این اشعار از ان استاد شریف است۔ بیت: ص ۸۰-۸۲

گلستان سخن ——— میرزا قادر بخش صابر

غالب تخلص، شیر نیستان سخنوری، ببر بیشۂ معنی پروری، یکہ تاز عرصۂ کمال، یگانۂ کشور افضال، سیاحِ زمین سخن، دانای نوادر فن، زبدۂ کملای جہان، مرزا اسد اللہ خان، المعروف بمرزا نوشہ سلمہ الرحمن، سخن سنج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دلپذیر ہے۔ خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوای جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا نشان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدوۂ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرتے، فضیلت نہ رکھتے۔ اور کمالات اگر اس زبدہ کملا سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ سیاہی رقوم، اس کی رنگینی معنی سے ہم شکل طاؤس، صفحۂ قرطاس، اس کے فروغِ مضامین سے، ہم رنگِ فانوس۔ برق طور اگر اس کی تجلی معنی کے مقابل ہوتی سرمہ ہوجاتی۔ شمع ایمن اگر اس کے شعلۂ فکر کے سامنے آتی فروغ نہ پاتی۔ ایوان سخن اس کی فکر کی معماری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت، بنای کلام اس طبیعت کی مدد سے قاف کے ساتھ ہم متانت۔ وصفِ بزم میں رفتارِ قلم رقصِ ناہید کے برابر، بیان رزم میں صریر خامہ نعرۂ شیر سے ہمسر۔ فکر اگر حوصلۂ ہمت کے لائق جہد کرے فضای لامکاں مرحلۂ مقصود کے روبرو دیدۂ مور سے تنگ نظر آوے۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جاوے خزانۂ تحت الثریٰ کو اس جایگاہ رفیع سے گنج قارون سے پست تر پاوے۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شوخی اشارات اور چستی عبارات، اگاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا،

جدائی کو فصل اور ملاقات کو وصل کی قبیل سے ٹھیرا کر مباحثِ سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حشو و زواید سے بزمِ کلام میں مثل صحبت زہاد اجتناب کرنا اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن اور مقتضیات فن سے ہیں جیسی اس ناظم کشور کمال میں مشاہدہ ہوتی ہیں کم کسی میں دیکھی گئیں۔ ابیات ریختہ عمارت ریختہ۔ وقایق فارسی جواہر قدس کا بیختہ۔ ہر چند اشعار ریختہ حد حصر سے خارج اور اندازۂ شمار سے افزوں تھے لیکن از بسکہ کمر یار اور دہان دلدار کا مضمون زیب اشعار ہوتا ہے انھیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دلبروں کے لب کے مانند نقطۂ انتخاب کے خال سے مزین کر کے ایک دیوان مختصر مرتب کیا۔ اور مجموعہ فارسی کا تو دیوان محشر سے بھی زیادہ اشعار پُر غوغا اور ابیات بلند صدا سے مملو اور مشحون ہے ریختہ میں گاہ گاہ اسد تخلص بھی کیا ہے لیکن غالب غالب اور ہر طالب اسی نام سے ہند و فارس میں اُس کے نشان کا طالب ہے۔

یہ چند شعر لکھ کر چشم بند غفلت کا چارہ اور جلوہ شاہد مدعا کو آشکارا کرتا ہے۔ (ص ۳۸۲ — ۳۸۳)

ہفت آسمان ——— مولوی آغا احمد علی احمد

.... وبرین وزنست مثنوی درد و داغ غالب۔ نام او اسد اللہ خان، تخلص غالب۔ او خوش گفتہ بیت:

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ‏ ‏ ‏ ‏ ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

عرف میرزا نوشہ، اکبر آبادی المولد و دہلوی المسکن، شاگرد میرزا عبد الصمد اصفہانی کہ پیشتر ہرمزد نام داشتہ۔ قوت طبع و قدرت سخن گزاری نظماً و نثراً مرکوز او مسلم است بلکہ بیشتر نثر او دلربا تر۔ لیکن حال سخندانی او سیما کیفیت قاطع برہان او کہ بیشتر درفش کاویانی خطابش کردہ و ہچنین جوہر تیغ تیز او از مطالعہ جوابہای آن خصوصاً مؤید برہان و شمشیر تیز تر بر تماشائیان سخن حالیست۔

در لارنس گزیٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۷ء نوشتہ عمر او تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است۔ مولوی عبد الحکیم جوش تخلص مدرس اسکول میرٹھ تاریخ وفات او کہ در سنہ ع یکہزار و دو صد و ہشتاد و پنج واقع شدہ چنین یافتہ مرد ہیہات میرزا نوشہ ملا شمس الملک مظفر الدین حیدر خان بہادر مظفر جنگ فرماید: شعر

سال میلاد او ست لفظ غریب ‏ ‏ ‏ ‏ سال فوتش بمرد غالب آہ

پس عمرش ہفتاد و سہ باشد۔

آغاز این مثنوی (کہ پنج ورق بیش نیست و در کلیات او بطبع آمدہ) این کہ بیت:

بے ثمری برزگری پیشہ داشت ‏ ‏ ‏ ‏ در دل صحرای جنون ریشہ داشت

آنچہ از اعتراض و اصلاح برین شعر خوک شدہ او واقع شدہ در مؤید برہان صفحہ (۴۴۲) مرقوم گشتہ ملاحظہ کردہ

وہم برین وزنست مثنوی رنگ و بوی او کہ ہمین چار ورقست۔ اولش اینکہ بیت:

بود جوان دولتی از خسروان ‏ ‏ ‏ ‏ غازہ کش عارض ہندوستان

وہم برین وزنست مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت عید الفطر بابوظفر بہادر شاہ نوشتہ ابتدایش اینکہ بیت:

باز برآنم کہ بدیبای راز ‏ ‏ ‏ ‏ از اثر ناطقہ بندم طراز

وہم برین وزنست دیگر مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت حید ولیعہد فتح الملک رقم کردہ، سر آغاز اینست بیت:

منکہ درین دایرۂ لاجورد ‏ ‏ ‏ ‏ کردہ ام از حکم ازل آنچہ خورد

قافیہ بلہجۂ قدما۔ الفاظ و تراکیب متقدمان در کلامش بسیار یافت می شود ہر چہ دلش خوش می کند می ذید، قبیح بود یا فصیح۔ در پایان این مثنوی گفتہ بیت:

گرچہ بہ از نظم نظامیست این ‏ ‏ ‏ ‏ مدح مخوان خط غلامیست این (ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

...ن شعرا ——— عبدالغفور نساخ

غالب تخلص، مخدوم اعظم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسداللہ خاں بہادر، نظام جنگ، معروف بہ میرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خاں، اولاد میں ...یاب کی ہیں۔ مولد ان کا اکبرآباد، مسکن دہلی، طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے۔ اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری ترشیزی و میرزا عبدالقادر ...کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے۔ اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے۔ بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتے میں بھی آئے ...راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۸۵ بارہ سو پچاسی ہجری میں انتقال کیا۔

(ص ۳۴۲)

...کرہ فرح بخش ——— نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

فردوسی رزم، خسرو بزم، کلیم کلام، نظامی نظام، جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں صاحب المتخلص بغالب دہلوی علیہ الرحمہ مشاہیر ...ے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے اور دیوان اردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہور آفاق ہیں، اس لیے صرف ...شعر تبرکاً لکھتا ہوں۔

بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ——— جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ ہجری شہر شاہ جہاں آباد میں جناب ممدوح کا انتقال ہوا۔ تواریخ انتقال اکثر شعرائے نازک خیال نے لکھی ہیں۔ ازاں جملہ ...ریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجکو یاد ہے، قابل تحسین و داد ہے،

جانِ اربابِ سخن، غالب عالی ہمت ——— ناظم سحر بیاں، ناثر والا فطرت
رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی و کمال ——— ثانی خسرو و سعدی و حزین و شوکت
ابرِ مدرارِ کمالات و فراتِ دانش ——— ماہر علم معانی و بیان و حکمت
ازجہاں کرد سفر سوی ریاضِ رضواں ——— گفت عباس کہ شایان سریر جنت

۱۲۸۵

(ص ۶۶-۶۹)

...ہنگ مجموعۂ سخن

غالب تخلص، نام ان کا اسداللہ خاں اور شاہ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، خطاب ہے۔ ۱۷۹۵ عیسوی میں خاص شہر دہلی میں متولد ...ے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں، قوم اتراک سے ہیں۔ مرزا غالب کے دادا کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہوکر ہند میں آئے اور لاہور میں معین الملک ...ر ہوئے۔ بعدہ دہلی میں آکر بادشاہی ملازمت اختیار کی۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبرآباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا ...پانچ برس کا تھا جب اُن کے باپ نے قضا کی تب نصراللہ بیگ خاں اُن کے چچا نے ان کو پرورش کیا۔ وہ از جانب مرہٹا اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ ...ایک صاحب بہادر گورنر جنرل کی طرف سے چار سو سوار کے رسالہ دار ہوکر دو پرگنوں کے جاگیردار ہوئے۔ آخر کو وہ جاگیر ۱۸۰۶ عیسوی میں ضبط ہوگئی او ...کے عوض تنخواہ ملنے لگی جب تو مرزا غالب شاہ جہاں آباد میں اکبرآباد سے آئے اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے ...بان اردو میں فقط میر کے معتقد تھے۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۸۶۹ عیسوی کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور دیوان قصائد فارسی ...رسی اور نثر فارسی میں تاریخ مہر نیم روز اور انشائی پنج آہنگ و قاطع برہان و تاریخ دستنبو اور اردو میں ایک دیوان غزلیات مختصر موجود ہے۔

(ص ۱۱۱ --- ۱۱۲)

انشائے نورچشم ——— نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ دہلوی المتخلص بغالب مصنف: ۱- مہر نیمروز ۲- ماہ نیم ماہ ۳- پنج آہنگ ۴- دستنبو ۵- دیوان فارسی ۶- دیوان اردو ۷- قاطع برہان ۸- تیغ تیز ۹- عود ہندی ۱۰- درفش کاویاں ۱۱- گوہر افشاں ۱۲- قادرنامہ ۱۳- پسا چین ۱۴- روان خیرین ۱۵- اردوی معلا-

ثانی ظہیر و ظہوری تھے- دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہی ملک بقا ہوئے- جناب ممدوح کے صدہا شاگردِ رشید میں سب سے کمتر یہ راقم آثم ہے- جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا- نواب موصوف نے ارسال صلۂ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی میرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ بھیجا- نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیے-

چند سال وفات سے پہلے مرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا- مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے میرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں جناب مرحوم نے اُن کو خط فارسی تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشای جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گزرے اور وہ میرے پاس موجود تھے- بمراد اشاعت کلام استاد و استفادہ ادبای نقاد، احقر العباد نے تبرکاً اس اپنی انشا میں رقم کیے-

منظوم

گفتم بخرد بخلوت انس
کی شمع و چراغِ ہفت ایوان

آیا ز چہ رو بود کہ نواب
ننوشت جواب نامہ ام ہان

آنگونہ عریضۂ کہ دانی
درویش نوشتہ سوی سلطان

آنگونہ قصیدۂ کہ گوئی
از صفحہ دمید سنبلستان

این ہر دو رسید و نیست پیدا
زانسو اثری بہیچ عنوان

رنجید مگر ز مدح نواب
ای کاش نگشتمی ثنا خوان

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم
از گفتۂ خویشتن پشیمان

عقلم بجواب گفت غالب
زنہار مخور فریب شیطان

نواب بفکر ارمغان است
تا نامہ فرستدت بسامان

وانہا کہ بخاطرش گزشت است
زود آنہمہ جمع کرد نتوان

زودست کہ جمع نیز گردد
دیرست کہ دادہ است فرمان

تا راہروان بجو بر گرد
آرند بکوششِ فراوان

دیبا ز دمشق و مخمل از روم
الماس ز معدن و زر از کان

فیل از دکن و زمرد از کوہ
توسن ز عراق و دُر ز عمان

فیروزہ نغز از نشاپور
یاقوتِ گزیدہ از بدخشان

جمّازہ تیز رو ز بغداد
شمشیر برندہ از صفاہان

پشمینۂ قیمتی ز کشمیر
زربفت گران بہا ز ایران

بالجملہ درنگ چون ازین روست
بر رنج و ملال نیست برہان

چوں پیر خرد بدل فریبی
گفت این ہمہ رازہای پنہان

گشتم بدم امید واری — مرہم نیز زخم یاس وحرمان
گفتم کہ چو با من این کرم کرد — آن قبلہ وقبلہ گاہ اعیان
ناچار ز راہ حق گزاری — تاکردہ شود تلافی آن
من نیز طلب کنم براتش — این مشکل اگرچہ نیست آسان
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیمان
از عالم غیب جام جمشید — از چشمۂ خضر آب حیوان
عمر ابد و نشاط دائم — نیروی دل وثبات ایمان
توفیق جواب نامۂ خویش — تعجیل عطا و بذل واحسان

منثور

والا یزدان ہست وبود آفرین راکہ گماشتن وخشور وفرستادن منثور از آلای اوست بے مرنیایش وآورندۂ گرامی منثور ہما ہمایون وخشور را کہ پس از وی ازان رہ نہ دد پیرہ وخشور کہ باز پسین آن جمع باخداوند در نام انبازی دارد ۔ ہر یکی بہر ہنگام بجای اوست ۔ بی اندازہ ستایش غالب سخن گزار ہیچ منگار ۔ اگر درین مردہ دلی سوی کلک وکاغذ گرائش دارد نامہ نگار را بسا دوستانند کہ سواد مردم چشم گزرگاہ آنان نشدہ ودر سیہ خیمۂ سویدائی دل می مانند ۔ نیرنگ روزگار دو رنگ نگرستنی ست پست پایگی بداں پایہ کہ از فرد ماندگی خاک نشین یکے شہرم وبلند نامی بدان اندازہ کہ بیپاکی گری خامہ ونامہ روشناس اعیان دہرم حاشا کہ این چنین پست پایۂ بلند نام جز من در دہر توان یافت ۔ از دیر باز بہ نظم ونثر می گرایم ۔ نظم خواہی پارسی وخواہی اردو خوابی ست فراموش ۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ ہر چہ نوشتہ می شود بکیدست در اردو ست ۔ اینک خواجہ حق پرست حق شناس بلند پایہ مولانا عباس کہ ہم ازاں گروہ پر شکوہ ست کہ با من بزبان قلم راہ سخن کشودہ اند ، از مہبای فرمان فرستاد کہ غالب فرسودہ روان بنام آن ہمہ دان نامہ در پارسی زبان نویسد ۔ یارب فرمان چون بجا آورم وہر نامہ چہ نویسم ۔ باری از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبش خامہ بقطعی چند کہ بخواندن نیرزد بر روی ورق فرو ریخت تا آن ورق ہم بہ پیچیدہ سوی کار فرما روان داشتہ آمد ۔ چشمداشت آنکہ برگ سبز از درویش بہ نخفگی پذیرفتہ آید ۔

نگاشتہ شنبہ وچہارم ربیع الاول سال رستاخیز (ص ۴۶ — ۵۲)

انتخاب یادگار —— منشی امیر احمد امیر مینائی

غالب، اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، خلف مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا، قوم ان کی ایبک ہے اقوام ترک سے ، جد اعلی ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے ۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہوئی ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی ۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد خواجہ غلام حسین خاں کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے ۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی ۔ پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے جس کا نام آتش پرستی میں ہُرمزد اور بعد قبول اسلام عبد الصمد تھا تلمذ ہوا ۔ دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی جب سن تمیز کو پہنچے مرزا الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا ۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعۃ النہار آشکار ہے ، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے ۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں ۔

فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں ۔

قادر نامہ، جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔

مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الد
اکبر بادشاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔

دستنبو، جس میں غدر کے واقعات ہیں۔

قاطع برہان، جس میں برہان قاطع کے بعض لغات پر خدشات ہیں۔

پنج آہنگ، اس میں فارسی زبان کے منشآت ہیں۔

اردو میں ایک دیوان

اور اردوی معلی

اور عود ہندی

ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔

الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت اُن کے نتائج فکر سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے اس سرکا
فیض آثار (ریاست رامپور) کے نمک خوار قدیم ہیں۔ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں طاب ثرا
ان سے تلمذ ہے۔ اُس عہد میں بھی وظیفہ خوار رہے۔ بندگان ولی نعمت ادام اللہ ظلال اجلالہم (نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیا
جانشین فردوس مکان) کے عہد دولت میں بھی جب تک زندہ رہے مورد پرورش بے شمار رہے۔ چوہتر برس کی عمر پائی۔ بارہ سو پچاسی ہجری
میں ذیقعدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی۔ سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ یہ ان کے کلا
کا انتخاب ہے جس کا ہر حرف لاجواب ہے۔ (ص ۲۴۰ – ۲۴۱)

شمع انجمن ——— نواب سید محمد صدیق حسن خاں

غالب، میرزا اسد اللہ خان دہلوی مخاطب بنجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر، از سخنوران نامی شاہ جہان آباد و صاحب قوت فکر خد
داد است۔ موجد مبانی خوش و مخترع معانی دلکش، شیر بیشۂ سخن پروری، شہریار مصر معنی گستری، در نثر و نظم طرز خاص دارد و تراکیب دلنشین
ابداع می نماید۔ بسیاری از معاصرانش قائل بکمال او در نثاری و نظامی اند، وجمعی از اقران بر طرز وادای کلام او اعتراضات کردہ اند چنانچہ از ملا
قاطع برہان و ساطع برہان چون صبح، روشن می شود۔ اما شک نیست کہ قدرت او بر اصناف سخن از نثر و نظم بیش از دیگران است قصاید و
مثنویات و غزلیات و رباعیات دارد اما مخالص قصاید خوب واقع نشدہ و قصیدہ بہتر از غزل می سراید۔ غالب قصاید او در مدح
حکام فرنگ و رؤسا و اکابر ہندوستان ست۔ از وظیفہ خواران بہادر شاہ پادشاہ دہلی ست۔ مذہب شیعی داشت، چنانچہ خود ہم گ
ے

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس … ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

و ہیچ وقت خود را از شرب مدام و گردش جام معاف نمی گذاشت۔ زبان فارسی نیک تر می داند و از ایراد الفاظ عربی حتی الامکان
گریز می نماید۔ مہر نیمروز و دستنبو و منشآت و جز آن از کتب فارسیہ یادگار او ست۔

محرر سطور در ایام اقامت شاہجہاں آباد محرر او را دیدہ و تقریر جادو تاثیرش گوش کردہ و غزلہا از زبان او شنیدہ۔ قصیدہ و غز
بسرعت تمام می گفت و طرز خود را در سخن بجی از دست نمی داد۔ احیاناً شعر ریختہ اردو ہم می گفت۔ دیوان مختصری در ریختہ دارد۔ دیوان فار
او بوجہ طبع دائر و سائر ست۔ مجموعۂ ابیاتش دہ ہزار و چہار صد و بست و چہار بیت است و ہر یک از روی شوخی تاثیر و خوبی تقریر، پیرا
گلوی بسمل و آویزۂ گوش دل ست۔

لفظ غریب تاریخ ولادت اوست۔ وفاتش در ۱۲۸۵ھ بوده۔ تتبع کلام ظہوری و عرفی شیوہ مرضیہ اوست و استفادہ از سخن طالب و حزین راہ و رسم دیرینہ او۔ بنا بر التزام چند گوہر شاہوار از صدف طبع او درین جا بسلک بیان کشیدہ می آید......... (ص ۳۴۷ — ۳۴۸)

آب حیات ——— محمد حسین آزاد دہلوی

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا۔ اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرائے ہند و رؤسائے اکبر آباد میں علوّ خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اُسی طرح اردوئے معلّٰی کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جاوے .... الخ

طور کلیم ——— سید نور الحسن خاں

غالب فخر عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر از افراسیابی دودمان اکبر آبادی مولد دہلوی مسکن لفظ غریب تاریخ ولادت اوست۔ وفاتش در ۱۲۸۵ھ واقع شدہ از تالیفات اوست پنج آہنگ، دستنبوی و مہر نیم روز و قاطع برہان در پارسی زبان دیوانی دارد مجموع ابیاتش دہ ہزار و چار صد و بست و چہار است۔ در اوائل بروش میرزا بیدل حرف می زد آخر الامر انداز دیگر مطبوع ابداع نمودہ و دیوانی کہ در ریختہ است فراوان ابیات ازان ساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ است۔ اولاً اسد تخلص می کرد چنانچہ در بعضی مقاطع غزلیات ہنوز موجود است۔ مدت مشق وی پنجاہ سال است۔ در پارسی پایہ اش از فحول اساتذہ کم نیست و در ریختہ ہم تبراش بیا را اگر کسی ست۔ اگر حدیقہ نظم را نو بہار است در عرصہ نثر نیز مرد کار است۔ قدرتی کہ بر جمیع اصناف سخن او راست نتواں گفت۔ نمی بینی کہ توجہ بعضی سخنوران ہمہ بغزل معطوف است و جز غزل نغمہ دیگر نمی توانستند سرودن، و راس المال برخی ہمہ قصیدہ است و جز قصیدہ ترانہ دیگر از ایشان نتوان شنودن و علی ہذا القیاس۔ غالب سخنوریست کہ اگر زمین غزل است باآسمان برده اوست و اگر عرصہ مثنوی ست پامال کردہ او۔ ہنگامہ اش بقصیدہ عرفی ہمپایہ است و چامہ اش چون غزل نظیری گرانمایہ و شگرف تر آنکہ وی بہزادی کہ قدم می کشود بسرعت تمام می پیمود و با اینہمہ فروغ مضامین و چستی تراکیب و شوکت الفاظ و رنگینیٔ معانی و متانت بیان و شستگی زبان کہ از شعرا کمتر کسی را بالقوۃ میسر بود و بالفعل نصیب او بود۔ آنچہ بہ نسبت دیگراں مبالغہ اش نامند و رینجا نفس الامرش خوانند۔ انصاف بالای طاعت است اگر بہ پیشینیان ہمسرش نگوئیم کہ الفضل للمتقدمین دیوانہ نیم کہ پسترش از ایشان پنداریم۔ باکمال سخنوری کمال سخن فہمی داشت و چنانکہ می شاید لطف شعری برداشت۔ حضرت شیفتہ می نگارد وی مضامین شعری را کماحقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پی می برد و این فضیلتی ست کہ مخصوص اہل سخن ست۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ برسی چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب ست اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو بہرہ یافتہ و حظی ربودہ انتہی

بنا بر ضابطہ شعری چند ثبت می شود ورنہ دیوانش ہمہ نقطۂ انتخاب است۔ (۴۲ — ۴۳)

بزم سخن ——— سید علی حسن خاں

غالب مرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک خلف الرشید عبد اللہ بیگ خان اکبر آبادی مولد و دہلوی منشا۔ حق اینست کہ زبان ریختہ از دکار بالا گرفت و گفتار پارسی پایہ والا اگر او را مجدد سخن گوئیم بجا است و اگر مجتہد فن خوانم روا فرد زشگر دودمان فصاحت است و شمع شبستان بلاغت۔ ستایش او محتاج بیان نیست۔ ہر کہ بہرہ از ادراک داشتہ باشد داند کہ او کیست و گفتارش چیست۔ در پارسی تصانیف متعددہ دارد۔ در ریختہ دیوانی گذاشتہ۔ در ۱۲۸۵ھ در گذشت۔ او راست......... (ص ۸۸)

جامع الاشعار ——— رِوَرنِڈ ایڈورڈ سیل

۱۷۹۵ء میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب ان کے باپ نے قضا کی .... وہ جاگیر ۱۸۰۶ء میں ضبط ہوگئی اور اس کے عوض تنخواہ ملنے لگی۔ ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ میں مطابق ۱۸۶۹ء کو اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ (ص ۳۰)

محبوب الالباب فی تعریف الکتب و الکتّاب ——— مولوی خدا بخش خاں

کلیات غالب چھاپہ دہلی، محتوی است بر قصائد و غزلیات۔

مرزا اسد المعروف بہ مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ابن عبد اللہ بیگ خان۔ اصل وی اتراک است۔ بعد ازیں کہ زمانۂ سلجوقیان سپری شد اجداد مرزا مزبور بہ سمرقند اقامت گزیدند۔ جد امجد حضرت ایشان از پدر بزرگوار خود رنجیدہ رخت بجانب ہندستان کشیدہ و در لاہور با معین الملک ملاقی شد و در سلک رفقای وی منسلک گردید۔ بعد ازیں کہ کار معین الملک خراب گشت وی بملازمت شاہی درآمد۔ والد مرزا نوشہ در دہلی متولد شد و ہمانجا نشو و نما یافت، باعث بعضے وجوہات توطن اکبر آباد گزید۔ مولد مرزا نوشہ اکبر آباد است۔ چون بعمر پنج سالگی رسید پدر میرزا جہان فانی را پدرود کرد۔ نصر اللہ بیگ خان عم مرزا دران زمان من قبل مرہٹہ صوبہ دار اکبر آباد بود، مرزا را بہ آغوش شفقت خود گرفتہ تربیت دے بر داشت۔ چونکہ میرزا نصر اللہ بیگ بموافقت جنرل لیک کارہای نمایان کردہ بود بجلدوی خدمت مرزا مشار الیہ را دو پرگنہ در مضافات اکبر آباد از دولت انگلشیہ جاگیر تا حیات شد۔ در سنہ ۱۸۰۶ء مرزا نصر اللہ بیگ مغفور فوت شد۔ موافق قرارداد جاگیر عطیہ ضبط گردیدہ وظیفۂ نقدی برای صاحب ترجمہ معین شد۔ عرصہ برین نگذشتہ بود کہ مرزا از اکبر آباد بدہلی شتافت۔ ہمان جا منزوی شدہ بر وظیفۂ معینہ قناعت کرد۔ یکبار بغرض سیاحت رخت بجانب بنگالہ کشید و چندی در کلکتہ ہم قیام داشت۔ روزی در یک مشاعرہ عزیزی اعتراضی بار دیگر شعر مرزا مزبور وارد کرد۔ مثنوی باد مخالف در جواب ہمان اعتراض است۔ باایں کہ بجدامی کارہای دنیا تعلق نداشت مگر باغایت عزت و تمکنت می زیست در شعر فارسی در عصری دیگری مثل وی نبردہ۔ دیوان بزبان اردو ہم دارد و در شعر اردو ہم روش فارسی نگذاشتہ۔ بہرحال ہر چہ از مرزا ست خیلی خوب است۔ در ایام غدر دہلی در آنجا بود و باعث بعضی ارباب ریاست کہ با فوج انگلشیہ خاص شاہ جہاں آباد بودند مرزا از مہلکہ آن رستاخیز قیاست نجات یافت و حالات خود را خود در رسالہ حوالہ قلم نمودہ آن را دستنبو نام کردہ۔ این رسالہ را محض بزبان فارسی بلا آمیزش کدامی الفاظ عربی نوشتہ باین قید این رسالہ ہم خوب نوشتہ۔ مرزا محض بروش شعرا می زیست و اقدام با قدح راح می کرد و در آخر عمر ثقل سماعت ہم داشت۔ مجموعہ نثر و نظم وی ہم فارسی و ہم اردو مجلد ضخیم می شود۔ عمر طویل کرد۔ در سنہ ۱۲۸۵ در دہلی وفات یافت۔

مطلع قصیدۂ اول سے

اے ذرہ ہم غیر غو غا در جہان انداختہ
گفتہ خود حرفی و خود را در گمان انداختہ

مطلع دیوان:

اے نخلا و ملا خوی تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ما جرا ۶۲۹-۶۳۱

.... الحق کلام میر عجب مذاقی دارد کہ کمتر در کلام دیگر شعرا ہم می رسد۔ اسد اللہ خان غالب کہ در عصر خود در شاعری نظیر خود نداشت فرمودہ،

قطعہ

میر کے شعر کا کیا حال کہوں میں غالب
اس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

.... شیخ امام بخش ناسخ کہ بقول غالب "طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار راہوں کے ناسخ تھے" معروف شاعری بود و او را در شعر اردو مسلم شمردہ .... (ص ۶۳۱-۶۳۲)

یادگار دہلی ———— مولوی سید احمد ولی اللٰہی

حضرت محبوب الٰہی کے روضۂ مبارک کے قریب ...... شروع بازار کے متصل

چونسٹھ کھنبہ سنگ مرمر کی ایک عمارت ہے نہایت عجیب سنہ ۱۰۲۴ ہجری کے بعد بنی ہے اس میں سنگ مرمر کے چونسٹھ ستون لگے ہیں۔ اس سبب سے اس کو چونسٹھ کھنبہ کہتے ہیں۔ اس میں مرزا عزیز الدین کوکلتاش خاں کی قبر ہے جو شمس الدین اتکہ خاں کے بیٹے ہیں۔ سنہ ۱۰۲۴ ہجری مطابق سنہ ۹ جلوس جہانگیری موافق ۱۱۲۴ء احمد آباد گجرات میں انتقال کیا اور یہاں لاکر دفن کیے گئے۔ ان کو جہانگیر کے دربار سے خان اعظم کا خطاب حاصل تھا یہ نہایت خوش تقریر و تحریر اور نستعلیق کے استاد تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اس عمارت کے شمال کی جانب ایک احاطہ میں

مرزا نوشہ غالب دہلوی

کا مزار ہے۔ عجیب پائے کا شاعر گزرا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دہلی میں شاعری کو ختم کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے عجیب و غریب دل و دماغ ان کا بنایا تھا۔ جس طرح فردوسی فارسی نظم میں عربی الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا اسی طرح مرزا نوشہ بھی اپنی نظم و نثر میں عربی الفاظ بہت کم استعمال کرتے تھے۔ فارسی تحریر میں تو مسلم الثبوت مانے ہوئے استاد ہیں مگر اردو میں بھی جو انھوں نے ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ بھی بالکل ایک نیا رنگ ہے۔ اگر ان کے دیوان کے اُن اشعار کو چھوڑ کر صرف صاف ستھری اردو کے اشعار پڑھے جائیں تو آدمی کو متحیر کر دیتے ہیں مثلاً دو ایک شعر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی　　یہ سمجھو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

جس دماغ سے یہ اشعار نکلے ہیں اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

مرزا نوشہ غالب، ابراہیم ذوق۔ مومن خاں یہ تینوں اپنے وقت میں فرد تھے۔ آپس میں بہت بڑی محبت اور اتحاد رکھتے تھے مگر ہر ایک کی طرز تحریر و وضع جدا جدا تھی۔

مومن خاں (ان کا مزار درگاہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے احاطے کے باہر جانب غرب واقع ہے) ذوق اور غالب سے بڑے اور عجیب وضع قطع سے رہتے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں ہاتھ پیروں میں مہندی لگی ہوئی، پور پور چھلّے انگوٹھیاں، پیر میں گیتلی جوتیاں، کمر پر زریں ٹوپی غرض ان کی یہ آن بان تھی، مگر ابراہیم ذوق کی مولویانہ بالکل وضع تھی۔ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے عالم تھے۔ اکثر ان کے ہاں عربی کتب کا درس رہا کرتا تھا۔ اول ہی دن سے نہایت متقی پرہیزگار، رندوں اور آزادوں کی صحبت سے متنفر تھے۔ اسی سبب سے آپ کے اشعار بالکل سادے سودے اور رنگ آمیزی سے خالی ہیں اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں شراب نوشی اور ہجر اور مصیبت کا ذکر آگیا ہے لیکن اُس ذکر میں نہ شراب نوشی کی رنگینی پائی جاتی ہے اور نہ فراق یار میں درد ٹپکتا ہے۔ آپ کی تمام عمر نہایت عیش کے ساتھ گزری۔ بہادر شاہ بادشاہ کے استاد تھے (ان کا مزار کلو کے تکیے میں متصل قدم شریف ہے)

مرزا غالب نرالی وضع رکھتے تھے۔ سر پر چوگوشیا اونچی بار کی ٹوپی اور ایک لمبی قبا اور اس پر ایک جامہ اور گھیتلا جوتی پہنتے تھے ضعیفی میں آپ کی کمر بھی جھک گئی تھی۔

آپ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ لوحِ مزار پر یہ تاریخ کندہ ہے

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد	اسد اللہ خان غالب مُرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں	تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح	ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک

(ص ۲۰۶ـ۲۰۷)

ماہنامہ **تہذیب الاخلاق** لاہور

سرسیّد کے اسی نام کے رسالے کی یادگار میں از سرِ نو گزشتہ سال سے جاری کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی سید صاحب کے رسالے کی طرح اخلاق و عادات کی اصلاح و درستی ہے لیکن زمانے کی مقتضیات ایک صدی میں بہت کچھ بدل گئی ہیں پرانی خرابیوں کے علاوہ اب مغربی تقلید کی خرابیاں پھیل رہی ہیں۔ رسالے کی غرض عقائد و افکار کے جملہ مفاسد کی نشان دہی کرنا ہے اور اس کے خاص مخاطب جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔

قیمت عہ رسالانہ ــ فی شمارہ عہ

پتہ

تہذیب الاخلاق ٹرسٹ ۳۔ ریس کورس روڈ۔ لاہور

رامپور کا ماحول شعر و سخن

راز یزدانی

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رامپور ہے۔ اس کی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رام پور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر گویا اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ راز یزدانی ہمارے مشہور اہلِ قلم میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی کاوش، فنی مہارت اور دیانت کے ساتھ اس کی داستان بیان کی ہے جو داستان کے ساتھ ساتھ تجزیہ بھی ہے۔

زیرِ ترتیب

نگار بُک ایجنسی رامپور

ناظم برقی پریس میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سنجی رام پور یو۔پی سے شائع کیا۔

عطیۂ عرشی زادہ

گزارش

آئندہ صفحات میں اردو علم و ادب سے متعلق چند کتابوں کے بارے میں کچھ تفصیلات شریک اشاعت ہیں۔ یہ کتابیں جدید انداز ترتیب و تہذیب کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہیں۔ انکی اشاعت سے اردو زبان و ادب کے بیش بہا نوادر عام دسترس میں آجائیں گے اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے مزید آسانیاں فراہم ہوجائیں گی صاحبان ذوق ان کتابوں کی خریداری میں بیش از بیش دلچسپی لیں کہ یہ کام اور زیادہ ترقی پذیر ہوجائے گا اور ان جیسے آئندہ کتنے ہی اہم کاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

منیجر: نگار بک ایجنسی رامپور یوپی

مکاتیب غالب (فارسی)

مولانا عرشی نے غالب کے اردو خطوط کی ترتیب میں جس نفاست خوش ذوقی اور احتیاط کا ثبوت دیا تھا وہ اب تک لوگوں کو یاد ہے اب غالب کے فارسی خطوط کا ایک مکمل مجموعہ انھوں نے تیار کیا ہے۔ اس میں مکتوب الیہم کے بارے میں ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ اور بہت سے دوسرے اسرار رموز کو بھی حل کیا گیا ہے۔ غالب کے مطالعہ میں مکاتیب فارسی کی بڑی اہمیت ہے۔ بدقسمتی سے اب تک ان سے اُس طرح کام نہیں لیا جا سکا۔ جیسا لیا جانا چاہیے تھا۔ امید ہے کہ یہ مستند نسخہ بہت سے لوگوں تک پہنچ سکے گا اور غالب کی ابتدائی زندگی کے دھندلے نقوش ابھر آئیں گے۔ زیر ترتیب

نگار بک ایجنسی رام پور

رامپور کا ماحول شعر و سخن

راز یزدانی

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا سب سے اہم دبستان رامپور ہے۔ اس کی آواز شعر و سخن کی بڑی متوازن آواز ہے۔ رامپور کے ماحول شعر و سخن کا مطالعہ کیے بغیر گویا اردو شاعری کا مطالعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ راز یزدانی ہمارے مشہور اہل قلم میں سے ہیں انھوں نے بڑی کاوش فنی مہارت اور دیانت کے ساتھ اس کی داستان بیان کی ہے جو داستان کے ساتھ ساتھ تجزیہ بھی ہے۔

(زیر ترتیب)

نگار بک ایجنسی رامپور

اردو داستانیں

تاریخ اور تجزیہ

راز یزدانی

اردو داستانوں پر تنقیدی اور تحقیقی دونوں حیثیتوں سے بہت کم کام ہوا ہے اور وہ بھی اس معیار کا نہیں جو اس موضوع کا تقاضا تھا۔ راز یزدانی مرحوم نے اس کام کو رامپور کی شہرہ آفاق لائبریری کی امداد سے باحسن وجوہ پورا کیا تھا۔ اُن کے تحقیقی مضامین اس موضوع سے متعلق اردو کے مشہور جرائد میں شایع ہوتے رہے ہیں اور اہل نقد و نظر نے اس کی ستایش کی ہے۔ یہی مضامین اب یکجا پیش کیے جا رہے ہیں۔

زیر طبع

نگار بک ایجنسی رام پور

بنامِ غالب

مرتبہ: اکبر علی خاں

اس مجموعے میں ایسے خطوط جمع کر دیے گئے ہیں جو غالب کے احباب و تلامذہ نے ان کے نام لکھے تھے۔ جہاں خطوط کے ذریعہ پہلی بار بہت سے نئے مسائل اور ان کا حل سامنے آئے گا وہیں خود مکتوبات غالب کے کتنے ہی تاریک گوشے روشنی میں آجائیں گے۔ غالب کے ماحول کو سمجھنے میں ان خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دیباچے اور حواشی کے سائے میں ان کا مطالعہ اور بھی دلچسپ سہل اور مفید تر ہو گیا ہے۔ (زیرِ طبع)

ناشر: ادارہ یادگارِ غالب پھلواڑ رامپور۔ یوپی

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

اسحاق النبی علوی

اس کتاب میں مؤلف نے ہجری اور عیسوی تاریخوں کے فرق کا ایک حل پیش کیا ہے جس کی بنیادوں پر تاریخ اسلام کا مطالعہ مستند ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوتا ہے۔ مستشرقین نے پہلی صدی ہجری کے اہم اسلامی واقعات پر تاریخی حیثیت سے جو اعتراضات کیے تھے یہ کتاب ان کا ایک مدلل جواب ہے اور اس لیے ایک ایسا کارنامہ ہے جسے نسلیں یاد رکھیں گی اور جس کی روشنی میں بہت سے بھٹکے ہوئے راستہ پائیں گے۔ (زیر ترتیب)

نگار بک ایجنسی رامپور یوپی

ترجمہ مجالس رنگین

نواب سعادت یار خاں رنگین بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔ اُن کی خوش ذوقی اردو دنیا میں مشہور رہے۔ مجالس رنگین نواب صاحب کی فارسی تصنیف تھی جس میں ادبی نشستوں کے دلچسپ واقعات بقید تاریخ درج کیے تھے۔ یہ رنگارنگ کتاب اس بات کی مستحق تھی کہ اُسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ کام مولانا عرشی نے انجام دیا ہے، ترجمے کے اعلیٰ معیار کی ضمانت اور اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے۔ (زیر طبع)

نگار بک ایجنسی رام پور

اردو اور افغان

اردو زبان کی بناوٹ میں زبان کے مورخوں نے عربی فارسی ترکی ہندی وغیرہ زبانوں کا ذکر کیا ہے اور سیکڑوں سال کے اُن تعلقات کو یکسر فراموش کر دیا ہے جو افغانیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رہے۔

یہ تعلقات حاکم، تاجر اور طالب علم تین حیثیتوں سے نسلوں سے قایم ہیں اور ناممکن ہے کہ اس میل جول کا اثر زبان پر نہ پڑا ہو۔

مولانا عرشی نے اسی عقیدے کی بنیاد پر تلاش و جستجو کے بعد ایک اہم نظریہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان میں سیکڑوں الفاظ یا پشتو کے ہیں یا ان کی مروجہ شکل افغانیوں کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے اور اس طرح اردو زبان کی بناوٹ میں افغانی بھی شریک ہیں یہ کتاب طرز استدلال اور حسن بیان کے ساتھ ساتھ اپنی ندرت کے لحاظ سے بھی ایک یادگار کارنامہ ہے جسے لسانیات میں ایک اہم مقام ملے گا۔

قیمت چھ ۶ روپے   نگار بک ایجنسی رامپور

اے اے آبرو ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس رامپور میں چھپوا کر دفتر نگار گھیر سخی رام پور سے شایع کیا۔

دیوان غالب فارسی

نسخہ عرشی

مولانا عرشی کا نام غالبیات کے سلسلے میں سند کا درجہ رکھتا ہے غالب سے متعلق جس انداز کا کام موصوف نے کیا ہے وہ یقیناً ان کے علاوہ کوئی دوسرا بمشکل انجام دے پاتا۔ اردو دیوان غالب کی ترتیب کے بعد اب فارسی دیوان غالب کو انھیں خطوط پر تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا ہے جس میں املا کے ساتھ توقیت گزاری کے اصولوں کی بھی بڑی احتیاط سے پابندی کی گئی ہے۔ غالب کی شاعری کا مطالعہ صرف یک رخہ رہ جاتا ہے اگر ہم اس کے فارسی کلام سے صرف نظر کرلیں۔ اس صحیح ترین نسخے کی مدد سے شائقین کو غالب کے غوامض سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

مقدمہ. تصریحات اور اشاریہ وغیرہ کے ذریعے موجودہ ذہن کے لیے ساری سہولتیں اس ایڈیشن میں مہیا کردی گئی ہیں۔

قیمت —— ۲۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

دیوان زادہ

شاہ حاتم کا شمار اردو شاعری کے استادوں
کے استادوں میں ہوتا ہے وہ اپنے عہد کے بڑے ترقی پسند
شاعر تھے۔ زبان کے سلسلہ میں ان کا انداز یہ ثابت کرتا ہے
کہ وہ سخت گیری کے مقابلے میں رواج کو پسند کرتے تھے جو بڑا
صحت مند نظریہ ہے انھوں نے اپنے عہد میں جس قدر بیدار مغز
ہونے کا ثبوت دیا ہے وہ اُن کی بڑائی کے لیے کافی ہے۔
ضرورت تھی کہ ایسے عظیم شاعر کا کلام سامنے لایا جاتا اسی احساس کے
پیش نظر حاتم کا دیوان زادہ تفصیلی مقدمے اور حواشی کے ساتھ شایع کیا جا رہا ہے۔

قیمت ——— دس روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

خوش نویسی کی تاریخ

مولانا امتیاز علی عرشی

انسان نے اشاروں اور زبان سے اظہار مطالب کے بعد تحریر کا سہارا لیا۔ اور پتھروں سے کاغذ و قلم تک آنے میں کئی منزلیں بڑی خوبصورتی سے طے کیں۔ اُس کا یہ ارتقا صحیح معنوں میں ارتقا تھا اس لیے کہ صرف پتھر سے کاغذ تک کا سفر نہیں تھا بلکہ حسن صورت کا بھی بتدریج اضافہ تھا۔ اور ایک زمانہ آیا جب خوش نویسی ایک فن بن گیا۔ وہ خط جس میں عربی فارسی اور اردو لکھی جاتی ہے ایرانی اور عرب میل جول سے بڑے نازک موڑوں سے گزرا ہے اور اس میں استادان فن نے بڑے کمالات کا اظہار کیا ہے ان استادوں کے اپنے اسکول ہیں اور اس طرح ان کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ مولانا عرشی جیسے مورخ نے ان خانوادوں کے کارناموں کی تاریخ بیان کی ہے۔ جو مستند حوالوں کی بنیاد پر ترتیب دی گئی ہے۔ زیر طبع نگار بک ایجنسی رام پور)

چھیڑ غالب سے چلی جائے

مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی بڑا سہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمو لیا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دل چسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

چند لکھنے والے

ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ حمید احمد خاں۔ پروفیسر آل احمد سرور شوکت تھانوی۔ ڈاکٹر محمد اشرف۔ سید وقار عظیم۔ ہری چند اختر حمیدہ سلطان۔ سراج احمد علوی۔ کنھیا لال کپور۔ فیاض عالم حاجی لق لق اور دوسرے۔

قیمت　　۵ روپے

نگار بک ایجنسی رام پور

دیوانِ ناظم

غالب کے دور میں اگر کوئی شاعر اپنے لہجے، اسلوب اور انداز فکر کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے تو وہ ناظم ہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم جو غالب کے مربی اور عزیز شاگرد تھے، اردو کے وہ یکتا شاعر ہیں جنھوں نے زبان و بیان میں غالب کا اتباع پوری فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ کر دکھایا۔ اور اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ لوگوں کو ان کے کلام پر عطیہ غالب ہونے کا شک گزرنے لگا۔ ناظم کا دیوان یوں تو ایک بار ان کی زندگی میں اور ایک بار مرنے کے بعد بھی چھپا تھا لیکن اب نایاب تھا اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ جدید انداز ترتیب و تہذیب کے ساتھ اسے چھاپا جائے۔ چنانچہ یہ دیوان ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ جس میں ناظم کے شاعرانہ محاسن سے کماحقہ بحث بھی کی گئی ہے شایع کیا جا رہا ہے۔

قیمت ـــــــ ۱۸ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

نکات و رقعات غالب

مرزا غالب نے انگریزوں کو اردو فارسی سکھانے کے لیے دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اور اس کی بنیاد پر انھیں خلعت اور دربار کے اعزاز سے نوازا بھی گیا تھا۔ غالب کی یہ دونوں کتابیں ایک عرصے تک مجہول رہیں۔ حسن اتفاق سے ان کا پتہ چلا۔ اُن میں سے ایک کتاب نکات و رقعات بھی ہے جس میں انھوں نے فارسی زبان کے اسرار و رموز بتائے ہیں۔

یہ کتاب اپنی اہمیت کے پیش نظر اس لایق تھی کہ اسے دوبارہ شایع کیا جاتا۔ چنانچہ ایک بھرپور تعارف اور آخر میں حواشی کے ساتھ اسے اکبر علیخاں نے ترتیب دیا ہے۔ غالبیات کے سلسلے کی یہ کتاب ہر لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔ قیمت — ۳ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

عظیم شریک کار

تصنیف • میرزا اسد اللہ خاں غالب

ترتیب و تصحیح • امتیاز علی عرشی

تزئین • عبدالرحمان چغتائی

اہتمام اشاعت • انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

ایک عظیم تر تخلیق

دیوان غالب (اردو)

نسخۂ عرشی

- غالب کے ذہنی ارتقا اور فنی نکھار کو روشن کرنے والی کلام کی تاریخی ترتیب
- دیوان غالب کے ۱۲ مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا متن تمام تر تفصیلات کے ساتھ اس طرح کہ آپ ان کے ذاتی مطالعے سے بے نیاز ہو جائیں۔
- غالب کے بیانات کی روشنی میں مرتب کتاب کا طویل مقدمہ جو مصنف کی شاعری کے مالہ و ماعلیہ کو نیکو بیانی کے ساتھ اجاگر کر دیتا ہے۔
- غالب کا ایک صحیح ترین فوٹوگراف اور ہند و پاک کے مشہور مصور چغتائی کی ذہنی کاوشوں کا کاغذی پیرہن غالب کی نادر خیالی تصویر کی شکل میں
- ضخامت ۶۳۲ صفحات ٹائپ کی خوبصورت طباعت دیدہ زیب رنگین گرد پوش

قیمت — ۲۰ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

انتخاب کلام نظام

رام پور اسکول کے شاعروں میں میاں نظام کا نام سر فہرست آتا ہے. مولانا نیاز فتحپوری نے نظام کو اپنے دور شاعری میں یوں بھی سب سے بلند مقام دیا ہے۔

ادا بندی میں وہ مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں اُن کا کلام سب کا سب اُستادانہ ہے لیکن اس پر بھی راز یزدانی نے جو خود ایک باشعور شاعر ہیں ایک انتخاب تیار کیا ہے اور اس میں پوری پوری سخت گیری سے کام لیکر صرف جواہر ریزے ہی مرتب کیے ہیں، رامپور اسکول کی طرف سے اردو شاعری کو یہ ایک بیش بہا ارمغاں ہے۔

قیمت ـــــــ دو روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

اے ایے ابرو ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس رام پور سے چھپوا کر دفتر نگار گھیر یحیٰ رام پور سے شایع کیا۔